ڈاکٹر علی شریعتی

توحید پرستی

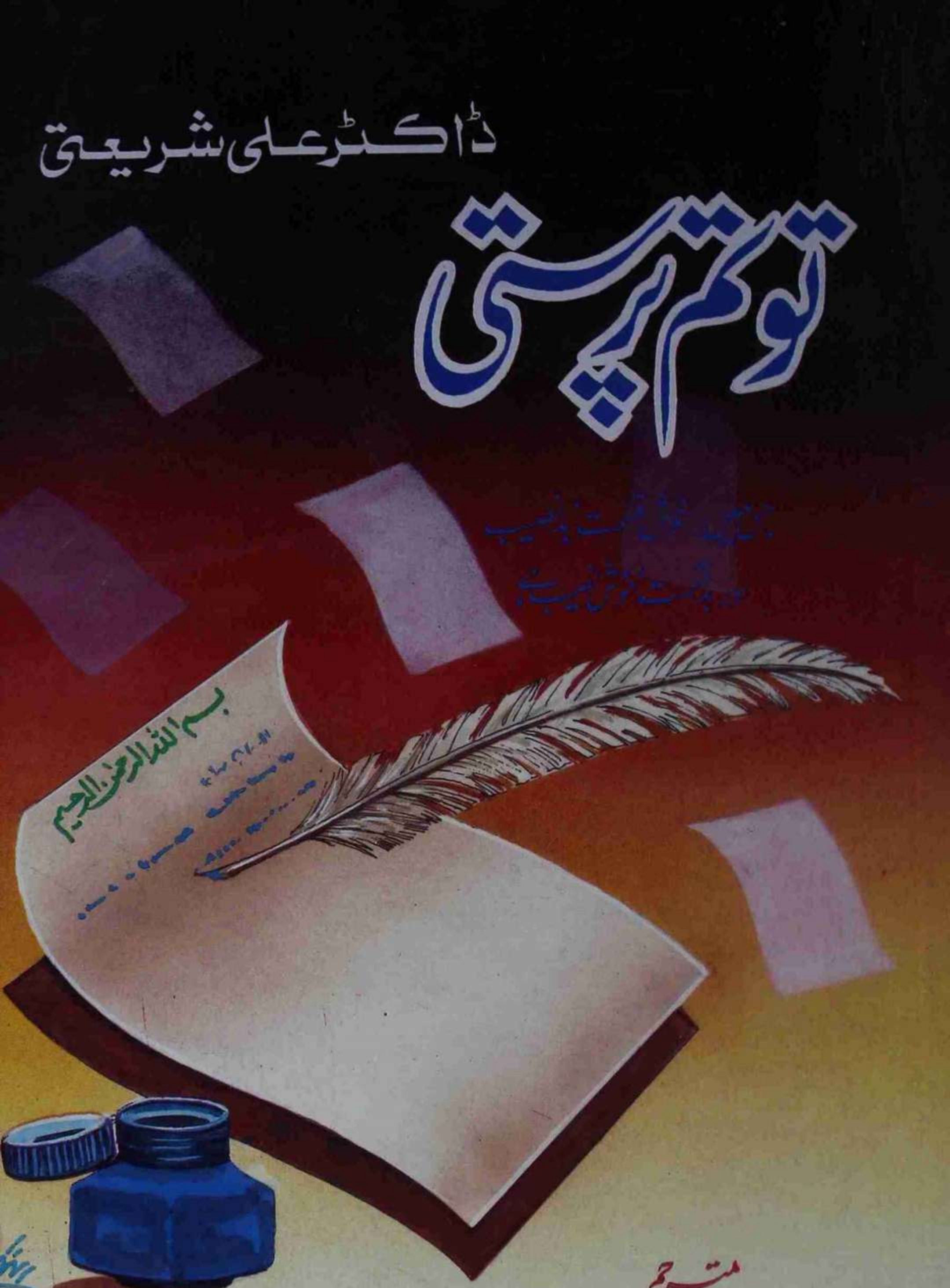

مترجم

سیّد محمّد موسیٰ رضوی

Acc No. 102066 Date 7/8/10
Status
D.D. Class
NAJAFI BOOK LIBRARY

ڈاکٹر علی شریعتی

786
1911

توتم پرستی

☆

جس میں: خوش قسمت' بد نصیب
اور بد قسمت' خوش نصیب ہے

☆

مترجم

سید محمد موسیٰ رضوی

NAJAFI BOOK LIBRARY
Shop No. 11
M.L. Heights
Soldier Bazar #2
KARACHI
PH. 7211795

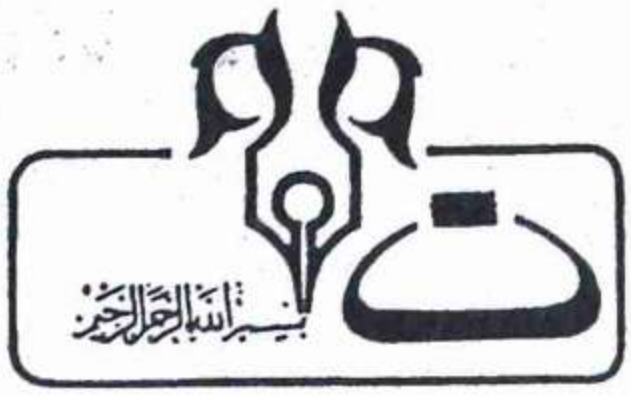

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

★★★

نام کتاب : توتم پرستی

مصنف : ڈاکٹر علی شریعتی

اردو ترجمہ : سید محمد موسیٰ رضوی

کمپوزنگ : VIS کمپیوٹر گلشن اقبال

فون : ۴۹۶۷۷۵۹-۴۹۷۲۵۹۳

پروف ریڈنگ : سید آل حسن رضوی

تاریخ اشاعت : مارچ ۱۹۹۸ء

تعداد : ۱۰۰۰

ناشر : ادارہ "ن والقلم"

اے-۸۷ بلاک ۵- گلشن اقبال

فون : ۴۹۶۶۰۶۸

قیمت : ۶۰ روپے

☆ ☆

اسے پڑھنا نہ بھولئے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ساری تعریف اس خدائے قلم کے لئے کہ جس نے زبان حرف کو قوت گویائی دی اور اس کے ذریعے حیرت انگیز ماورائی، پوشیدہ مفاھم کو پردہ ذہن پر مرتسم کرکے اس کے بستہ لب خاموش زبان سے وہ کچھ کہلوایا کہ جو دائرہ فہم سے باہر تھیں۔

اور دورد و سلام ہو اس اشرف مخلوقات پر کہ جو "اول ما خلق اللہ القلم" کی حدیث میں ہدایت کا نور بن کر آیا اور دائرہ وجود کا پہلا نقطہ اختیار کرکے "سر اللہ فی کل موجود" بنا۔

اور رحمتوں اور برکتوں کا نزول ہو اس خانوادہ عصمت و طہارت پر کہ جو "راسخون فی العلم" ہے اور باب مدینہ علم نے "این الذین زعموا انہم الراسخون فی العلم دوننا، بغیا" وکذبا" علینا" کہہ کر ہر کسی کے راسخ فی العلم ہونے کے زعم کو باطل کردیا ہے--- جو "اہل ذکر" ہے، "اولی الامر" ہے، "بقیتہ اللہ" ہے، "حجتہ اللہ" ہے "صراط اللہ" ہے اور اس کے اسرار کا محافظ ہے۔

اما بعد "توتم" کیا ہے، یہ تو کتاب ہی کے آغاز میں آپ کے ذہن

عالی میں آجائے گا' مگر سمجھنے اور سمجھانے کا جو طریقہ علی شریعتی نے اختیار کیا ہے اور جن گہرائیوں تک اس کی نظر گئی ہے وہ قابل مطالعہ اور لائق تحسین ہے۔ موضوع خواہ کتنا ہی عام فہم' جانا پہچانا' سہل اور آسان کیوں نہ ہو اسلوب بیان اس کی جان ہے اور جس کو اس پر عبور ہو وہ لوگوں کے دل جیت لیتا ہے اور ہر کوئی اس کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔

علی شریعتی کا کمیت قلم جس میدان میں دوڑتا ہے بازی لے جاتا ہے اور ہر کسی کو متحیر کردیتا ہے۔ توتم پرستی کے ضمن میں "کتاب" کے موضوع کو چھیڑ کر اس نے کن کن چہروں سے نقاب اتاری ہے' کن کن باتوں کو آشکارا کیا ہے' پس پردہ سیاست کی کس طرح دھجیاں بکھیری ہے' کتابوں کے بارے میں لوگوں کی عمومی روش کو کس طرح آڑے ہاتھ لیا ہے' یہ آپ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد ہی سمجھیں گے۔

اس دور میں کتاب واقعی غریب ہے اور اس کو لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کرنے والا اس سے بھی زیادہ غریب ہے' اگر کوئی غیر معروف شخص کسی ایسی کتاب کو منظر عام پر لانا چاہتا ہے کہ جو ۱۴ صدیوں سے لے کر اس صدی کے اختتام تک بھی پوری دنیا کے بازار

ادب میں منظرعام پر نہیں آئی ہے تو صرف اس لئے اس کی ایک سطر بھی پڑھی نہیں جاتی کہ اس کو پیش کرنے والا ایک غیراہم آدمی ہے۔ چنانچہ یہی کچھ اس بے بضاعت حقیر کے ساتھ بھی گزری کہ جس نے اس ملک کے ایک کثیرالاشاعت عظیم الشان روزنامہ کے مجلّہ میں اس کتاب کو پیش کرنے کی کوشش کی جس کا ترجمہ تمام یورپی زبانوں میں ہوچکا ہے اور جو ۱۳۵۰ قبل مسیح میں لکھی گئی ہے اور مشرق وسطیٰ کے ممالک کی قدیم تاریخ کے اعتبار سے اور اس تجزیہ کے اعتبار سے بھی جو اس تاریخ کے سماجی اور نفسیاتی پہلوؤں پر کی گئی ہے ایک نہایت دلچسپ، معلوماتی اور بے نظیر کتاب ہے تو انتخاب کے عمل پر مامور جناب "ا + ن + و + ..." صاحب نے اس کے ایک سطر کیا ایک لفظ پر نگاہ نہیں کی اور صاف ٹھلادیا۔ اس واقعے اور علی شریعتی کی داستان میں فرق ہے تو یہ کہ علی شریعتی کی کتاب طباعت کے عمل سے گزری مگر نامرئی ہاتھوں نے اسے لوگوں تک پہنچنے نہیں دیا اور میری کتاب قابل اعتناد نہیں ٹھہری اور یوں اس کی کتاب بھی میری محنت کی طرح ضائع ہوگئی۔

بہرصورت، علی شریعتی، کتاب کو اس خریدار کی ملکیت نہیں سمجھتے جسے اس نے خرید کر ریک میں لا چھوڑا ہے۔ وہ کہتے ہیں کتاب

اس کی ہے جو اسے کھولتا ہے' پڑھتا ہے' سمجھتا ہے' ورک کرتا ہے' محظوظ ہوتا ہے اور اس سے اثر لیتا ہے۔ کتاب' کتاب کو پڑھنے والے' کتاب کو سمجھنے والے' اور کتاب کی تعظیم و تکریم کرنے والے کا "توتم" ہے۔

ہر کسی کا ایک "توتم" ہے اور کس کا کیا "توتم" ہے اور اس کی تفصیل کیا ہے اور کس پر اس کا احاطہ ہے یہ تمام وہ باتیں ہیں جسے آپ اس کتاب میں پڑھیں گے' اور اس کے طرز بیان سے لطف اندوز ہوں گے اور ملاحظہ فرمائیں گے کہ قلم کس طرح علی شریعتی کا "توتم" ہے۔

خدا اس توتم شناس کو' اس کو جس نے اپنا "توتم" نہیں بیچا' جس نے اس کا خون نہیں پیا' اسے کسی زور آور یا زر آور کے حوالے نہیں کیا' جو اس کی اطاعت میں سراپا تسلیم رہا' اس کی وفاداری میں درندوں کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالا' قیصر کا اسیر نہیں بنا' یہود کی زر خریدی میں نہیں آیا' اپنے ان بندوں کا قُرب نصیب کرے کہ جنہوں نے گردنیں تو دیں مگر کسی متکبر' بدنسلے کے ہاتھ میں ہاتھ نہیں دیا اور عظمت حق کا علم اس شان سے بلند رکھا کہ :

خود سے شرمندہ ہے بیعت کا سوالی اب تک
ظلم کا ہاتھ ہے پھیلا ہوا خالی اب تک

خدا' صدیقہ طاہرہ' اِنسیّہ حوَرا' بتول عذَرا' فاطمہ زھرا سلام اللہ علیھا کے صدقے میں اس معزز و محترم گھرانے کے آستانے پر سجدہ ریز' والہ و شیدا کو۔ اس حق سے محروم کی جانے والی مظلومہ' کے غمگسار کو۔ اس' بیت الحزن میں صبح و شام رونے والی جگر گوشہ رسول کے نوحہ خواں کو۔ اس' بعد پیغمبر ستائی جانے والی شہزادی کونین کے فریادی کو۔ اس' صبح روشن کو شبہائے تار میں بدلنے والی مصیبتوں سے ہمکنار ام المصائب کے ماتم دار کو۔ اور اس' اللہ کے بہترین مخلوق کی بہترین بیٹی اور حجتہ اللہ الکبریٰ کی زوجۂ طاہرہ کے عزادار کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے' اور ہماری پوری زندگی اور پوری ہستی بلکہ حیات کے ہر ہر لمحہ کو اس خاتون جنت کے لئے وقف کردے کہ جس کی ایذا رسانی' رسول کی ایذا رسانی اور جس سے محبت رسول سے محبت ہے۔

حلقہ بگوش خاندان نبوی

سید محمد موسیٰ رضوی

☆

صاحب تصنیف کا ایک دانش بھرا معروضہ

آپ اس تحریر کو' اس باضابطہ مقالہ کی نظر سے نہ دیکھئے کہ جسے میں نے اشاعت کے لئے لکھا ہو' اور جو محترم پڑھنے والوں کے لئے آئین و روش و عادت و رسوم کا حامل ہو اور وہ اسے دقت نظر سے مطالعہ کریں اور ادبی معیار پر پرکھیں' اور لکھنے کے فن میں رائج موجودہ انداز کے ضوابط کی بنیاد پر حکیمانہ جائزہ اور ادیبانہ انتقاد کا نشانہ بنائیں۔

اپنی دوبارہ عمر کے آغاز میں' علی شناس تنہائی نے--- کہ جو اس "صحرا" میں ایک بے برگ و بار "تنہائی" کے مارے درخت کی طرح "تنہا جیتا ہے' تنہا مرتا ہے اور تنہا محشور ہوتا ہے---" اپنے آپ کو بجلی بن کر میری روح میں اتارا اور میں نے--- اس بجلی میں--- اپنے آپ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا! اس نے بہ رنگ "خورشید" ایک قلم میرے ہاتھ میں دیا اور میرے قلم کو--- کہ جو بہ رنگ "سیاہ" تھا--- میرے ہاتھ سے لیا۔

اور میں نے اس رات بیٹھ کر اپنے ایمان کو لکھا'

اور بس!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اقراء بسم ربک الذی خلق
خلق الانسان من علق،
اقراء و ربک الاکرم
الذی علم بالقلم،

.....

(جبرئیل کا پہلا پیغام)

توتم پرستی

(Totemisme)

ہم ابھی تک "توتم" پرست یا باالفاظ دیگر محبوب پرست ہیں، ہر کسی کا ایک "توتم" ہے۔ ہر کوئی، موجودات عالم میں سے کسی نہ کسی سے تعلق خاطر رکھتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ اس کا تعلق اس موجود سے پوشیدہ طور پر اتنا گہرا ہے کہ اسے بیان نہیں کیا جاسکتا اور وہی اس کا "توتم" ہے، وہ اپنی شخصیت کو اپنے "توتم" سے جدا نہیں

سمجھتا۔ اپنے آپ کو اسی میں دیکھتا ہے۔ اپنی حقیقت کی نری سچائی کو اسی میں پاتا ہے۔ ہر کسی کا "توتم" "خود" وہ ہے' کہ جس نے اس کی ذات سے باہر اپنا وجود بنالیا ہے اور جسمانیت اختیار کی ہے۔

ایک تلوار کے دہنی' ایک مرد میدان' ایک سورما اسب سوار اور ایک صحرائی چابک سوار کا "توتم" اس کی "تلوار" ہے۔

عرب کے دور جاہلیت کا شاعر کہتا ہے :

"اے میری تلوار' میں تجھے ہر روز دشمن کا تازہ خون پلاتا ہوں اور ہر روز تجھے تشنہ ترپاتا ہوں۔

اے میری تلوار' "معد" قبیلے کی مائیں اپنے ناز پرور بچوں کو تیرے لئے پال رہی ہیں۔

اے بنی معد کی ماؤں' اپنے نرینہ بچوں کو خوب اچھی طرح دودھ پلاؤ اس لئے کہ میری تلوار ازحد پیاسی ہے'

سنا ہے کہ ماؤں کی چھاتیوں کا دودھ شیر خوار بچوں کے حلق میں خون بن جاتا ہے۔

ہولناک معرکوں میں' اے میری تلوار کتنی کوششیں ہوئی ہیں کہ تم کو مجھ سے جدا کردیا جائے' چاہ بنی راغم کے کنارے' سلعا کے پہاڑ تلے' وطیس کی سرزمین میں معد کے جیالے مردوں نے ہمارے قافلے

پر ہلہ بول دیا۔ ہمارے پاس دو تلواروں سے زیادہ نہیں تھا اور ساتھ میں عورتیں، بچے، بھیڑ بکریاں اور سامان تجارت تھا، ان کے پاس دسیوں شمشیر زن تھے اور ہمراہوں میں کوئی نہیں تھا۔ ہم لوگ لٹ گئے، ہماری عورتوں کو قیدی بنا کر لے جایا گیا، ہمارے اونٹوں کو پے کیا گیا لیکن وہ تمہیں مجھ سے نہیں چھین سکے۔ بھلا کس طرح وہ مجھے تم سے دور کرسکتے تھے اس لئے کہ اگر میں بستر مرگ پر بھی پڑجاؤں اور میری جان بھی لے لی جائے تو اس وقت بھی وہ تمہیں میرے ہاتھ سے نہیں چھین سکتے۔ مگر یہ کہ کندھوں سے میرے بازو کاٹ دیئے جائیں اور تمہیں میرے کٹے ہوئے بازو کے ساتھ --- کہ جو تم سے دور نہیں ہوگا --- مجھ سے دور کردیا جائے۔"

آپ نے ماہر کبوتر بازوں کو بھی دیکھا ہوگا؟ سویرے، سویرے، نیند سے اٹھ کر سگریٹ منہ سے لگاتا ہے اور ان لمبے لمبے کشوں کے ساتھ کہ جس کے دھویں کو اس کے زخمی سینے کی کھانسی لمحہ بہ لمحہ باہر نکالتی ہے بڑے ذوق و شوق سے، پرواز کے نشہ میں مست گھر کی چھت پر آتا ہے، کبوتروں کے دڑبے کو کھولتا ہے اور اچانک دسیوں، خوبصورت رنگا رنگ کبوتروں کی پھڑپھڑاہٹ کا شور بلند ہوتا ہے کہ جو دیر سے اس لمحہ کے انتظار میں ہوتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے، "بام

دوست کے گرد" چکر لگانے لگتے ہیں اور وہ--- کبوتروں کا شیدائی--- صبح کے خوبصورت' صاف ستھرے آسمان کے سینے پر نظریں جمائے اپنی والہانہ نگاہوں کو دو نامرئی یا نظر نہ آنے والے کبوتروں کی طرح اپنے کبوتروں کی جھنڈ میں بھیجتا ہے تاکہ وہ بھی ان کے ساتھ اڑیں' گھومیں پھریں' چکر لگائیں' تفریح کریں' آزادی کی لذت سے لطف اندوز ہوں اور آزادی کی پاک و صاف' لطیف اور کھلی ہوا میں سانس لیں اور کبوتر باز--- کہ جس کے پاس خدا کی ان تمام پیدا کردہ نعمتوں میں بجز اس کے کبوتروں کے اور کچھ نہیں' جو کبوتروں کے علاوہ اور کچھ نہیں جانتا' جسے کبوتروں کے علاوہ اور کسی چیز سے دلچسپی نہیں' جو اپنے کبوتروں کے لئے ہے اور کبوتروں کے سوا نہیں ہے--- ایسے حیات بخش اور لذت آفریں لمحوں میں' ایسی پاک صاف' خوبصورت' اچھی' پیاری اور سرور آور فضا میں

"زندگی گزارتا ہے۔"

کبوتر اس کا "توتم" ہے' اس کا مفہوم زندگی ہے' اس کی ہستی ہے' اس کے زندہ رہنے کا بہانہ ہے' کبوتر کے سوا جو کچھ ہے وہ اس کے لئے پتھر ہے' مجسمہ ہے' مٹی ہے' بدصورت ہے' بے رنگ ہے' بے آب ہے' بیہودہ ہے۔

ایک موسیقار کے لئے فن موسیقی سے تعلق رکھنے والے لوگ، نیز آرگن، گٹار، طبلا، بانسری اور پیانو جیسے آلات موسیقی اس کے "توتم" ہیں، اس کے اندر جیتے ہیں، اس سے بات کرتے ہیں، اس کے ساتھ ہیں، اس کے علاوہ اور جو کچھ بھی ہے وہ اجنبی ہے، عبس ہے، بیگانہ ہے، بیکار ہے۔

ایک سکے جمع کرنے والے کا قیمتی کلکشن جسے اس نے ساری عمر بیٹھ کر مکمل کیا ہے، اس کا "توتم" ہے۔

پیرس میں ایک اسٹیمپ کلکٹر نے ایک عجیب داستان کو جنم دیا۔ اس کے اسٹیمپوں کی سیریز میں ایک خاص اسٹیمپ کی کمی تھی، اس نے اس کی تلاش میں برسوں گزارے، ہر جگہ سفر کیا، اخباروں میں اعلانات شائع کئے، بہت کچھ کیا، بڑی تکلیفیں جھیلیں، انتظار کی گھڑیاں کاٹیں، بے تحاشا پیسہ خرچ کیا اور عمر کے آخری حصے میں اسے حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ ایک ایسے عالم میں اسے یہ چیز ملی جب وہ پوری طرح مایوس ہوچکا تھا۔ اس کی خوشی ناقابل بیان تھی۔ اب اس کا وقت بیہودہ صرف نہیں ہو رہا ہے، وہ بہت خوش تھا۔

لیکن افسوس کہ ایک بری گھڑی اس کے انتظار میں تھی اور یہ سب اس کا پیش خیمہ تھا تاکہ وہ بے رحمی اور سنگدلی سے اچانک اس

پر اپنا وار کرے۔

یہ بوڑھا شخص ایک ہوٹل کے دو کمروں میں زندگی بسر کرتا تھا۔ ان دو کمروں میں وہ تھا اور اس کا پورا خاندان : اس کے اسٹیمپ! اور اس کا پیارا اور لاڈلا بچہ : وہی اسٹمپ کہ جو ایک عمر کے انتظار کے بعد اپنے بوڑھے باپ کی آغوش میں آیا تھا۔

گرمی کی ایک صبح کو وہ بوڑھا شخص اپنے کمرے سے باہر نہیں آیا، ہوٹل کے رکھوالے نے ہرچند گھنٹی بجائی مگر اندر سے کوئی آواز نہیں آئی، اس نے دروازہ بجایا، زور زور سے آوازیں دیں مگر کچھ حاصل نہیں ہوا، تب اس نے دوسری چابی لاکر اس سے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوا۔

بوڑھا آدمی اپنے اسٹیمپس کے کھلے ہوئے البم کے پاس مردہ پڑا تھا!

بڑا کھوج لگایا مگر نہ اس پر کسی ضرب کا نشان تھا اور نہ زہر کی علامت! اس کی موت نامعلوم تھی۔ کل تک وہ بھلا چنگا تھا، بہت خوش، بہت مسرور، بچوں کی طرح تروتازہ اور شاداب، اس کے کمرے سے کافی دیر تک صدای ترنم بلند تھی۔ خودکشی بھی نہیں کی تھی۔ کسی نے اس کو کوئی صدمہ بھی نہیں پہنچایا، پھر کیوں.....؟

اچانک' اس کے گرد حلقہ لگائے کھڑی پولیس' سی آئی ڈی اور ہوٹل کے ملازمین کے درمیان سے اس کے ایک قریبی دوست اور واقف کار ساتھی کی نظر اسٹیمپ کے کھلے البم پر پڑی اور اس نے حیرت سے دیکھا کہ وہ آخری ٹکٹ اس کے البم سے غائب ہے!

"توتم" مرگیا' وہ نہیں تھا!

چند سال پہلے ایک ایسی خبر نشر ہوئی کہ جو کتاب شناس اور آدم شناس لوگوں کے ذہن پر ہتھوڑا بن کر گری اور سب کو محو حیرت کردیا۔

استاد سعید نفیسی مرحوم نے اپنی ساری عمر کتابوں کے درمیان گزاری۔ کتابوں ہی کے بیچ بوڑھا ہوا اور کتابوں ہی کے کنارے جان دی۔ ایک ایسے شخص کے لئے کہ جو کتابوں کا عاشق ہے یہ دنیا ایک ایسا بے در و بے پیکر و بے مصرف مسافر خانہ ہے کہ جس کے ایک گوشے میں صرف ایک مٹھی بھر کتابیں ہی کام کی ہیں اور یہی وہ گوشہ ہے جو کسی مفہوم کا حامل ہے اور اس قابل ہے کہ انسان اپنے آپ کو وہاں تک پہنچائے' ان کے ساتھ "محشور" ہو' ان کے ہمراہ بسر اوقات کرے' "مشترک زندگی" گزارے اور اپنی پوری عمر ان کی خدمت میں رہے۔

ایک کتاب پرست انسان اور اس کی کتابیں، کتنا خوبصورت ملاپ ہے۔ انسان اور کتاب کی دوستی، کتنی پاکیزہ اور پیاری دوستی ہے، اور کتب خانہ اور کتابیں کتنا خوش قسمت گھر اور گھرانہ ہے کہ جس کے سرپرست نے اپنی زندگی اور تمام آرزوؤں کو اس چھوٹی سی چہار دیواری میں کہ جو اس کے لئے کائنات سے زیادہ بڑی ہے، محصور کرلیا ہے۔

نفیسی مرحوم کتاب شناس تھے، کتاب دوست تھے، کتاب باز تھے۔ عاشقِ کتاب، بے قرارِ کتاب، وقفِ کتاب اور محوِ کتاب تھے۔ مردِ کتاب یا کتاب سے شغف رکھنے والا۔ اندیشہ و احساس، شرف و تقویٰ اور مناعت و انسانیت کا حامل بھی ہوتا ہے۔ میں نہیں کہہ رہا کہ وہ ہر نقص اور ہر کمزوری سے مُبرّا ہوتا ہے۔ نہیں، جس طرح کہ وہ نہیں تھا۔

اسلام کو دیکھئے کہ وہ کس طرح سوچتا ہے؟ ہر وہ شخص جو مسلمان نہیں کافر ہے۔ لیکن بے کتاب کا کافر نجس ہے اور اہل کتاب کا کافر پاک! وہ پڑوسی مسلمان ہے جس کی دیوار سے دیوار ملی ہوئی ہے! کتنی حیران کن بات ہے! کتاب (آسمانی مفہوم میں نہیں عمومی مفہوم میں) کافر کو پاک کرتی ہے! یعنی کتاب۔ دھوپ، آگ، مٹی اور پانی کی طرح

مطہر ہے، میں کن الفاظ میں کہوں؟ اسلام کی طرح مطہر ہے....!

قربان جاؤں اپنے امی عوام کے کہ جن کا دشنام "لامذہب" اور "بے کتاب" ہے! (۱)

نفیسی ایک عرصے تک مجلس شوریٰ سے متعلق کتب خانے کے انچارج تھے، ایک ایسے "مقیم" کے لئے ایک ایسے "مقام" سے زیادہ خوشگوار اور مناسب اور کون سی جگہ ہو سکتی ہے۔

کتاب، کتاب شناس اور کتاب فہم کی جاگیر ہے۔ چار چیزیں ایسی ہیں جو کسی کی مالکیت برداشت نہیں کر سکتیں، کوئی ان کا مالک نہیں ہو سکتا۔ مالکیت کی سند ان کے لئے بے معنی ہے، ابلہانہ ہے، بے عقلی ہے، ان کے لئے رسم و رسومات، حدود و قوانین، عرفیات اور کریڈٹ، سند، مہر، دستخط، گواہ اور بیع و شراء کی بات بیہودہ و مہمل ہے۔

ایک کتاب، دوسرا معبد، تیسرا زیبائی، اور چوتھا دل ہے۔

دل سے مراد کیا ہے؟ دل یعنی دل، ذہن نہیں، ذہن، صاحب ذہن کی ملکیت ہے۔ صاحب ذہن اپنے گھرانے سے مربوط ہے، اس کا گھرانہ اس کے شہر سے اور اس کا شہر اس کے ملک سے مربوط

۱- ایران میں یہ مذکورہ جملے زبان زد خاص و عام ہیں۔

ہے.....

ملاحظہ فرمایئے اس کا معاملہ کتنا روشن، کتنا درست اور کتنا منطقی ہے۔ اس میں بال برابر بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ ذہن، عقل یا بھیجا اپنے مالک کے بدن کا ایک حصہ ہے اور بس۔

لیکن دل ایک بہت بڑ معجزہ اور عجیب شے ہے، اس کا معاملہ کچھ اور ہے۔

دل کیا ہے؟ ایک سمجھدار، اچھے، دردمند انسان کا دل کہ جو ایک لطیف و عمیق مرموز کیفیت کا حامل ہے بعض موجودات کے نہایت وجود میں ان کے دونوں پیروں کے اوپر مخفی ہے۔

لیکن اس پمپ نما خون سے بھرے ہوئے صنوبری گوشت کے لوتھڑے کو بھی کہ جو جانداروں کے اندرونی اعضاء کا ایک حصہ ہے اور خون سے بھری مٹھی کی طرح تمام انسانوں اور حیوانوں کے سینے کی جال میں دھڑک رہا ہے تاکہ ان لوگوں کے پاس کہ جن کا "دل" نہیں ہے اور سرے سے نہیں جانتے کہ وہ کیا ہے کبیدہ خاطر نہ ہوں اور جان لیں کہ دل وہی ہے کہ جو گردے کا جلیس ہے، وہی کہ جو گردے، پوٹے، بٹ، کھیری، چار عدد پایوں، اوجڑی اور سری کے ساتھ ایک مکمل نہاری کو تشکیل دیتا ہے اور ایک کثیر العیال خاندان کا پیٹ

بھرتا ہے اور ان کے رات کے لئے بھی بچ جاتا ہے اور پھر "اپنے اثرات" کو بھی اپنے کھانے والے پر ظاہر کرتا ہے۔

بشرطیکہ وہ دل اور گردہ حلال گوشت جانور کا ہو۔

ان لوگوں نے جنہوں نے کہ اپنے لئے مکمل آسودگی پیدا کرلی ہے۔ اپنے وجود کے سب سے بڑے عضو رئیسہ یعنی اپنے پیٹ کو "دل" کا نام دیا ہے۔ (۱) اور فلسفے' مذہب' عرفان' الہام' اشراق' ادب' آرٹ' شعر' عشق' احساس' ریاضت' تزکیہ' تقویٰ اور صفا جیسی چیزوں سے پیچھا چھڑالیا ہے۔ اب صرف "صابن کے پانی کا تنقیہ" ان کی مشکل کو دور اور ان کے مسئلہ کو حل کرتا ہے اور ان کے (پیٹ کے) درد' بے چینی' اضطراب' التہاب' شور و شر' فغان و غوغا' بے قراری اور ظاہر نہ ہونے والی تکلیف کو تسکین اور کہی نہ جانے والی باتوں' سربہ مہر رموز' پوشیدہ کیفیات۔ ان کے چھپے گوشوں' ناپیدا اعماق اور سربستہ دنیا کو کھول دیتا ہے۔ (۲) بالکل صاف' ستھرا' دھلا ہوا' زنگار سے پاک..... کتنی اچھی توفیق' کتنا اچھا سکون نفس اور کیا خوب صفائی باطن۔

۱- اہل ایران' پیٹ کے درد کے لئے "دل درد" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ (مترجم)

دل کو چار انگل نیچے قرار دے کر بڑے آرام سے انہوں نے اپنا پیچھا چھڑالیا ہے اور مشرق و مغرب میں چھڑی ہوئی دائمی لڑائی اور فلسفہ و تصوف کی حل نہ ہونے والی کشمکش کو صلح کل میں بدل دیا ہے۔ نیز نبوغ انسانی کی تین ہزار سال کی لاحاصل جستجو اور روح انسانی کی پچاس ہزار سالہ جواب سے عاری دغدغہ کو ایک "ٹھیک ٹھاک اور ثمر بخش" ڈکار کے ساتھ اختتام کو پہنچا کر "رستگاری" حاصل کی ہے۔

لیکن دل، وہ عجیب و غریب چھپا ہوا مستور دل کہ جو بعض آدمیوں کے باطن میں مخفی ہے اپنے کام میں بھی عجیب و غریب ہے، وہ ایسی چیزوں کا سراغ لگاتا ہے کہ جن کو ہماری عقل نے کبھی سوچا بھی نہیں۔ عقل کی توجہ کبھی ان چیزوں کی طرف جاتی ہی نہیں۔ تاہم ہماری عقل کن چیزوں کو سمجھ سکتی ہے؟ یہی کہ مثلاً کس طرح پتنگ اڑائی جائے۔ حساب جوڑے کہ ایک آدمی کو کتنے کیلوری کی ضرورت ہے۔ جب کسی عزت مآب کو جلاب لگے تو کسی علمی فنی طریقہ سے اسے روکا جائے تاکہ وہ کم از کم اس راہ میں شہید نہ ہو۔ کونسا طریقہ اختیار کیا جائے

۲- اس پیرے میں علی شریعتی نے پیٹ کو "دل" کہنے والوں پر ادبی انداز میں بھرپور طنز کیا ہے اور پیٹ میں گڑبڑ اور خرابی کی صورت کو مذکورہ الفاظ میں سمو کر تنقید سے تسکین کی بات کی ہے۔

کہ فلاں لمبے ہاتھ والے آدمی سے جس سے کہ اس کی واقفیت نہیں ہے--- اور اس سے واقفیت بھی اس کے لئے ایک حیاتی مسئلہ ہے--- تعلق قائم ہو' حاجت مند آدمی کو سبق پڑھائے کہ کس طرح دُم ھلائے اور پوسی پوسی کرے تاکہ خان صاحب کا مزاج حاجت بر آری کے لئے ہموار ہو؟ کس جوڑتوڑ کے ساتھ "زندگی" کو قائم رکھے کہ جو آبرومندانہ بھی ہو اور سال کے آخر میں اطمینان خاطر' تقویت قلب اور حرارت حیات کے لئے کچھ بچا بھی رکھے؟ کن ترکیبوں سے ایسا کچھ کیا جاسکتا ہے کہ سرکاری' وقفی' اور آستانہ سے متعلق زمینوں کی قرعہ اندازی میں اس کا نام نکل آئے' کن خوبصورت تدبیروں سے چہرے مہرے' پیٹ' گردن' کھانسی' آواز' ادا و اطوار اور فضل کے تمام لوازمات اور علم کے تمام اثاثوں کو اس طرح مرتب کیا جاسکتا ہے کہ انسان ایک سال تک روزانہ سو' دو سو اور تین سو لڑکوں کی کلاس میں آئے جائے اور کسی ایک کو بھی یہ گمان نہ ہو کہ صاحب کورے ہیں بلکہ سب کو اس بات کا یقین ہو کہ وہ اس درجہ قابل و لائق ہے کہ ہر موضوع کو پڑھا سکتا ہے!

عقل کے بس میں اس طرح کے کام ہیں۔ لیکن دل کا مقام ان باتوں سے اجل و ارفع ہے اور اس کی پرواز ان سائبانوں سے بہت

بلند ہے۔ عقل صرف دو کام جانتی ہے۔ ایک یہ کہ وہ "معلوم" کر سکتی ہے اور دوسرے یہ کہ "چال بازی" کر سکتی ہے' اور بس۔ "سمجھنا" عقل کا کام نہیں' دل کا کام ہے (۱) بنیادی طور پر دل کچھ اور ہے' کہیں اور ہے' اس کا تعلق اس دنیا کے مقولہ سے نہیں' کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ وہ کس کا ہے؟ کس سے منسوب ہے؟ اس کی وابستگی کس چیز سے ہے' اس کا متولی' اس کا مالک' اس کا سرپرست' اس کا رئیس اور اس کا آقا کون ہے؟

میرا کہنا تو یہ ہے کہ یہ اس دنیا کی نہیں' اپنے مالک کی نہیں' یعنی اس آدمی کی نہیں جو اس کے اندر ہے چہ جائیکہ باہر کا کوئی دوسرا' تیسرا' چوتھا یا پانچواں آدمی۔

دوسری چیز جسے مالکیت برداشت نہیں' جو قابل خرید و فروخت و معاوضہ و معاملہ و رہن--- اور مال الاجارہ نہیں' زیبائی ہے۔ دو پیارے لبوں کے ایک دوسرے کے ساتھ "ملاپ" (یعنی بند لبوں" کی زیبائی یا پارسا آدمی کے دو لبوں کی ایک دوسرے سے "سندر جدائی"

۱- اس گفتگو کو ان باتوں سے نہ ملایا جائے کہ جن پر صوفیوں اور فلسفیوں کا کئی ہزار سال سے جھگڑا ہے۔ مسلمان کا جھگڑا کسی اور بات پر ہے۔ اس کا محاذ "خندق" ہے اور عقل' وہی دل' صوفی کا نہیں علی کا۔

(یعنی دعا کے لئے لب کھولنے) کے حسن سے لے کر ایک رسیلی آنکھ کے معجزہ تک کہ جو خواستگاہ نگاہ ہے اور اس سے آگے ایک لطیف احساس' ایک بلند پرواز روح اور بڑھتے بڑھتے خدا کی زیبائی تک کیا یہ ممکن ہے کہ ان کے لئے مالکیت کی سند تنظیم کی جائے؟ رجسٹر میں ان کا اندراج ہو؟ اور پھر دستخط لئے جائیں اور گواہی دی جائے کہ : "اندراج' سند کے مطابق ہے؟" اس پر اسٹیمپ لگایا جائے؟ ان کی تصدیق شدہ نقول صادر کی جائیں؟ انہیں خریدا یا بیچا جائے؟ زیبائیاں خود دلوں کے گھرانے کے افراد ہیں۔ ہر زیبائی اس دل کی جنس ہے جسے وہ درک کرتا ہے۔ صبح کی مسکراہٹ کی ساری رعنائی' غنچے کے کھلنے کی ادا' نصف شب کی خاموشی میں چمن زاروں کے رواں چشموں کے زمزمے' ایک خوبصورت سوچ کی زیبائی' ایک پیاری تحریر یا پیاری گفتگو' ایک حسین پینٹنگ' اور ایک پرکشش' شاداب اور اسرار آمیز روحانی کیفیت..... کس کی ملکیت ہے؟ کس کی جائیداد ہے؟ کون اس کا مالک ہے؟ کس کا اس پر حق ہے؟--- ان سب کا تعلق ایک ہی ملک سے ہے' یہ سب ایک ہی فرد کی ملکیت ہیں' وہی دل ان کا حقدار ہے جو ان سے آشنا ہے جو ان سے قربت رکھتا ہے' جو ان کی قدر و قیمت جانتا ہے اور انہیں سمجھتا اور درک کرتا

ہے۔

یہی سبب ہے کہ وہ خسیس باغبان کہ جو تمہیں اپنے باغ سے گھاس کا ایک تنکا بھی توڑنے نہیں دیتا--- اجنبی نگاہوں سے ایسی کیفیت کے ساتھ کہ گویا تمہارے خصوصی حق پر اس کا تصرف نہیں--- تمہیں آزاد چھوڑ دیتا ہے تاکہ تم باغ کے منظر اور اس کے ایک ایک پھول کی زیبائی کو اپنے اندر سمیٹ لو!

وہ محسوس ہی نہیں بلکہ اعتراف کرتا ہے کہ یہ سب کچھ تمہارا اپنا ہے۔

ہوا پر کس کا حق ہے؟ اس کا کہ جو اس کے ایک حصے کو اپنی قید مالکیت میں لائے؟ یا اس کا کہ جسے اس کی ضرورت ہے تاکہ وہ جی سکے؟ جو اس کے اندر بالیدگی' نشاط اور انبساط کی لہر دوڑائے۔ یہ اس سینے کی جاگیر ہے کہ جس کے بغیر وہ گھٹ کر مرجائے گا۔

کیا یہ مضحکہ خیز اور ابلہانہ بات نہ ہوگی اگر کوئی کہے کہ "اس گھر' اس مکان' اس کھیتی کی ہوا کا مالک میں ہوں اس لئے کہ یہ گھر' یہ مکان اور یہ کھیتی میری ہے اور تمہیں اس میں دم مارنے کا حق نہیں' یہاں تمہیں گھُٹ کر مرنا ہوگا' ہوا میری ملکیت ہے اور یہ ہے اس کی سند' مہر' اور کورٹ کا اسٹیمپ اور دستخط۔"

میں پوچھتا ہوں کہ آخر اس عدالت کے ترازو بردار کی آنکھیں کیوں بند ہیں۔ اس کی آنکھیں اس لئے بند کی گئی ہیں تاکہ وہ یہ نہ سمجھے کہ اس کے ترازو میں کیا ہے؟ اگر وہ دیکھتا تو عدالت اتنی مخبوط الحواس اور بدوضع نہ ہوتی۔ میں عدالت کی بات کررہا ہوں ظلم کی نہیں۔ ظلم کا معاملہ تو صاف ہے۔ ظلم کی آنکھیں بند نہیں۔ وہ چار آنکھوں سے دنیا کو دیکھ رہا ہے۔ ہر ایک پر اس کی نظر ہے۔ ہرگز اس سے غلطی سرزد نہیں ہوتی۔ یہ فرشتہ عدالت ہے کہ جس کی آنکھوں کو کولہو کے بیل یا تانگے کے گھوڑے کی طرح باندھ دیا گیا ہے تاکہ وہ نہ دیکھ سکے کہ دیو اس کے ترازو میں کیا رکھ رہا ہے۔ اس کے پلڑوں میں کیا تبدیلی لا رہا ہے۔ وہ نہ جانے کہ اس کے ہاتھ میں ترازو کا کانٹا کیا کچھ کررہا ہے' اسے معلوم نہ ہو کہ اس کے ترازو کو پابند سلاسل کردیا گیا ہے اس سے ٹیڑھی عمارت آویزاں کی گئی ہے۔

تیسری چیز معبد ہے' کمائی کی دکان اور رہنے کا گھر کہ جو مالک بھی رکھتا ہے اور دکاندار بھی۔ معبد کا تو کوئی مالک نہیں ہوتا' (صاحب خانہ تو سنا ہے) صاحب معبد بھی کسی نے سنا ہے؟ اگر سنا ہے تو یقیناً" اس معبد کو دکان بنادیا گیا ہے اور دین کو بکاؤ مال اور عبادت کو تجارت اور..... ذات شریف' سوداگر کہ جو لوگوں کے ایمان سے

روٹی کھاتا ہے۔ آپ نے ایسے اداکاروں کو نہیں دیکھا ہے کہ جو لوگوں سے پیسے اینٹھتے ہیں تاکہ انہیں حب مال کی خاطر ملامت کریں؟

معبد' پر اس کے عابد کا' خانقاہ پر اس کے راہب کا' دیر پر اس کے پیر کا اور محراب پر اس کے امام کا حق ہے اور مسجد اس مضطرب آدمی کی جگہ ہے کہ جو عشق کے عالم میں فرش پر سجدے بکھیرتا ہے اور جانتا ہے کہ صرف اسی آدمی کا سجدہ مقبول ہے کہ جو انکساری کو قابل فخر سمجھتا ہے۔ یہ تولیت' موقوفہ' متولی' عمارت' معمار' کاشی ساز' اور مسجد کے خادم کی باتیں' سب ہیچ و پوچ ہیں۔ محراب کا بیانہ اور مسجد کی پیش نمازی کی بات بھی ان ہی باتوں کی طرح ہے۔ "لوئی میسینیون" میرا ہے۔ اس کی بیوی' اس کے بچے' اس کا ہمسایہ' اس کا چچا' اس کی خالہ' اس کے محلے کے رات کا چوکیدار' اس کا ڈرائیور' اس کا قابل احترام کلیگ اور وہ صاحب یا صاحبہ جس کی دکان پر میسینیون اپنے کپڑے دھونے اور استری کرنے کے لئے دیتا تھا'--- مجھے معلوم نہیں کہ اس کے کیا ہیں' البتہ اس سے لاتعلق نہیں ہیں۔ اس کا رشتہ فرانس سے یا پیرس سے بالکل اسی طرح ہے جس طرح اس کا اپنے سونے کے بستر سے' اپنے بچپن کے جھولے سے' اپنے اس چادر سے جس میں نومولودی کے عالم میں اسے لپیٹا جاتا تھا۔ (۱)

←

اور آخر میں..... کتاب!

بعض تاجر پیشہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کتاب بھی پریشر کوکر، کلہاڑی، پائیجامہ، شلوار، گھریلو سامان اور کھانے پینے کی اشیاء کی طرح کوئی شے ہے اور اس کا مالک وہی ہے کہ جو اس کے جلد پر چھپی ہوئی قیمت کو ۲۰ فیصد رعایت کے ساتھ ادا کرتا ہے۔ خواہ وہ اسے لاکر ایک ریک میں سجائے تاکہ فوٹو گرافی یا انٹرویو کے موقع پر اس سے اس کی آبرومندانہ زندگی اور شان و شوکت ظاہر ہو اور وہ گھر کی ڈیکوریشن کا حصہ بنے۔ اس کے خیال میں کتاب بھی گڑیا، گلدان، پلاسٹیکی بندر، کتے، بلی، چینی کے برتن، اور کمرے کی سجاوٹ کے دوسرے سامانوں کی طرح ہے کہ جس کے پیسے اس نے ادا کرکے اس کی رسید لے لی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ "کتاب کی قیمت" وہی رقم ہے کہ جس کو فلاں تاجر پیشہ آدمی نے لکھ کر اس دوسرے تاجر پیشہ آدمی

۱۔ کتنی معیوب بات ہے کہ ہم مولانا "روم" کے بارے میں اس بات پر جھگڑیں کہ وہ ایرانی تھے؟ رومی تھے؟ یا روسی؟ اتاترک، نادر شاہ اور پطر کبیر کا تعلق ملکوں سے ہے لیکن مولانا؟ مولانا کسی کے نہیں ہیں اس کے ہیں جو مثنوی کو سمجھتا ہے۔ شمس کس کا ہے؟ مولانا کا۔ لیکن مولانا کا بھائی اپنے خاندان کا ہے، اپنے محلہ کا ہے لیکن مولانا کا نہیں ہے۔ متوسط درجے کے لوگوں پر ملکیت اور تخصیص عائد ہوتی ہے۔

کے حوالے کیا ہے۔ اف میرے لئے کتنا دردناک ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ کسی کتاب کو، دیوان شمس کو، حافظ کو، علی کے نہج البلاغہ کو، محمد کے سلمان پاک کو، ایک کتاب فروش (آہ کتنا بدنما اور ترس آور ہے یہ جملہ! یہ شغل!۔۔۔ کتنا بڑا پاپ، اور کتنی بڑی تقصیر ہے) بیچتا ہے اور اس کے عوض ۲۷ ریال یا زیادہ سے زیادہ ۵ / ۱۸ تومان "اس کی قیمت" وصول کرتا ہے اور خوش بھی ہوتا ہے کہ اس سے اس نے کچھ فائدہ بھی حاصل کیا ہے۔ (۱) اور وہ خریدار بھی خوش کہ اس نے کتنی دیدہ زیب جلد اور خوبصورت طباعت والی کتاب خریدی ہے اور اس کا سائز بھی ٹھیک ٹھاک ہے اور ریک میں بالکل ٹھیک بیٹھتی ہے..... وہ "ریک" کہ جسے اس نے پہلے سے اس کو "مقید" کرنے کے لئے اپنے گھر میں سجا رکھا ہے۔

۱- ان لوگوں کے لئے کہ جن کو ہمیشہ واضحات میں توضیح کی ضرورت ہوتی ہے اور ان کی زندگی ہمیشہ حاشیوں میں گزرتی ہے عرض کرتا ہوں کہ کتاب فروش حضرات کی نسبت میرا کوئی غلط تاثر نہیں ہے۔ میں کتاب کے کاروبار کو جائز سمجھتا ہوں حتیٰ کہ اس کی خرید و فروخت کو بہترین نوعیت کی خرید و فروخت میں شمار کرتا ہوں، مگر یہاں الفاظ اور تعبیرات کچھ اور مفہوم کے حامل ہیں۔ زبان رائجہ نہیں۔ اگر آپ اس تحریر کو اس نظر سے پڑھیں جس نظر سے کہ آپ کسی اخبار، کسی درسی کتاب یا کسی فقہی رسالہ کو پڑھتے ←

کتابوں کا "ریک!" بے رحم، سنگدل اور بے شعور لوگوں کی کتابوں کا ریک۔ کیا کتاب کوئی خرگوش ہے؟!

کسی کو کیا خبر کہ مجھے میسینیون سے کتنی رغبت ہے؟! میں اسے کتنا عزیز رکھتا ہوں؟! وہ کیسی عظیم روح، کیسی فطانت اور کس حسن و خوبی کا حامل تھا۔ کتنا آزاد منش انسان تھا۔ اس نے ۱۹۰۵ء سے ۱۹۳۳ء تک ۲۸ سال مسلسل کام کیا اور اس کے ایک عمر کی محنت اور انتھک کوششوں کا ثمرہ "سلمان پاک" کی صورت میں سامنے آیا اور میں ایک سال تک اول شب سے قریب سحر تک نہ سویا اور سلمان کے عشق اور میسینیون کی یاد میں جاگتا رہا اور کتنے شوق، کیسی امید اور کس کیف اور والہانہ انداز میں اس کا ترجمہ کیا!

اور وہ کتاب منظر عام پر آئی۔

میسینیون کی زندگی کے ۲۸ سال۔ ذرا غور تو کریں اس میں کتنے ملین یا کتنے ملیارڈ لمحے بنتے ہیں! جس کا ہر لمحہ ہمارے بہت سے علماء، ادباء، فضلاء اور اساتذہ کی ابدیت سے زیادہ قیمتی، زیادہ بھرپور اور

ہیں تو آپ اسی طرح اسے لیں گے کہ جس طرح حال ہی میں روضہ خواں حضرات اور ہوٹل والوں نے ایک ہی وقت میں ایک ہی زبان کے ساتھ (میری کتاب) "کویر" کو پڑھا، سمجھا اور اس پر تنقید کی۔

اس موازنے کے لئے میں انتہائی معذرت خواہ ہوں۔

زیادہ شاداب ہے! اور مجھے اس کے ہر ہر لمحے اور ہر ہر دقیقے پر حسرت ہوتی ہے۔ اس کے ہر لمحہ کی عطش اب بھی میری ہڈیوں میں شرارہ بن رہی ہے۔ مجھے اس وقت کے ہاتھ سے جانے کا بڑا قلق ہے اور اس کے ہر لمحہ کا گزرنا میرے لئے اپنے ایک عزیز کے گزرنے سے کم نہیں ہے اور میں اب اپنی عمر کے آخری حصے تک اس غم میں ڈوبا رہوں گا اور اب یہ داغ میرے دل سے نہیں دھلے گا۔

ان لمحوں، دقیقوں، سانس اور شبوں پر محیط ۲۸ سال۔ نیز میں نے اپنے گرم اور پر تپش راتوں میں سے ایک سال کے عرصے کو اس ایک جلد میں سمویا اور جب وہ تیار ہو کر منظر عام پر آئی تو میں نے اس پر لکھا دیکھا :

ساڑھے چھ تومان!

اور اس کے دوسرے دن میں نے خود اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھا کہ ایک خریدار کہ جس کے بغل میں دو روٹی اور ہاتھ میں ایک کلو گوشت تھا کتابوں سے متعلق برابر والی دکان پر آیا اور اس نے ان سامانوں کے ساتھ "سلمان" کی ایک جلد کتاب بھی خریدی اور میں نے دیکھا کہ اس نے اس کی قیمت ۵ تومان ادا کی اور اس کتاب کو روٹی اور گوشت کے ساتھ گھر لے گیا!

اس کے بعد مجھے نہیں معلوم کہ میری کیا کیفیت ہوئی؟ ایک ایسی حالت مجھ پر طاری ہوئی کہ محراب بھی چیخ اٹھا۔ ایک مدت کے بعد جب میں نے آنکھ کھولی تو دیکھا کہ رات کے تین بجے کا عمل ہے اور میں اپنے کام کے کمرے میں اپنے زانوؤں میں سر دیئے بیٹھا ہوں اور مجھے اپنے کمرے کی لائٹ جلانا بھی یاد نہیں رہی ہے۔

میں اپنے آپ کو تسلی دے رہا تھا بالکل اسی طرح جس طرح لوگ کسی غمزدہ آدمی کو تسلی دیتے ہیں اور اپنی تسلی مابانہ گفتگو پر یقین نہیں رکھتے۔

میں اپنے آپ سے کہہ رہا تھا! بھئی یہ مشہد ہے' یہاں اس سے زیادہ توقع نہیں کی جاسکتی۔ مگر مشہد کہاں ہے؟ امام کی ایک قبر (مطہر) ہے اور وہ بھی خالص نہیں' قالینوں سے مزین ہے۔ (۱) امام کی قبر کونے میں اور ہارون کی بیچ میں ہے۔ (۲) اطراف میں لاکھوں بکی ہوئی قبریں ہیں یا پھر ان کی بکنگ ہوگئی ہے' یا انہیں پیشکش کے لئے روکا گیا ہے اور پھر یہاں ایک تعداد ان لوگوں کی ہے جو قرآن و دعا کا

۱- قالینوں سے مزین ہونے اور اس نسبت سے قبر مطہر کے خالص نہ ہونے کی بات غالباً" علی شریعتی کے اس جذبے کا رد عمل ہے جسے اہل مشہد نے شدید ٹھیس پہنچایا تھا وگرنہ تزئینات کا عمل محبوب کی نسبت محبوں کا فطری تقاضا ہے اور اس کا نہ ہونا چاہنے والوں کے لئے باعث شرم ہے۔ (اردو مترجم)

۲- میرا خیال ہے کہ غالباً" ازروئے اشتباہ یہ الٹا چھپ گیا ہے۔ (اردو مترجم)

ورد کرنے والے ہیں۔ ان ہی میں زیارت خواں اور روضہ خواں افراد بھی شامل ہیں۔ اطراف میں رمل و فال کی دکانیں سجانے والے لوگ ہیں' اور پھر موم بتی بیچنے والے' گلاب کا عرق فروخت کرنے والے' سینہ زن' زنجیر زن' تیغ زن' چاقو زن اور ہر طرح کے لوگ بکھرے ہوئے ہیں' اجرت پر نمازیں پڑھنے والے' کرائے پر روزہ رکھنے والے' نہیں معافی چاہتا ہوں کرایہ پر نہیں ٹھیکوں پر! کرایہ پر کی اصطلاح ان لوگوں کے لئے جو پگڑی کے بجائے خالی پگڑی کے نیچے پہنی جانے والی ٹوپی پر اکتفا کرتے ہیں' جن کی داڑھی حنائی اور انگلیاں ہر قسم کی عقیق کی انگوٹھیوں سے معمور ہوتی ہیں۔ ان کے پیر میں خوش منظر گیوہ (ایک خاص قسم کا کپڑے کا جوتا) جلوہ گر ہوتا ہے اور وہ' نئے میدان میں آنے والے پیش نمازوں کے پیچھے مقتدی بن کر کھڑے ہوتے ہیں اور دو سے پانچ تومان تک لے کر ان حضرات کی اقتدا کرتے ہیں۔ (نرخ کا اختلاف ان حضرات کی ظاہری شرعی تقدس کی بنیاد پر ہوتا ہے۔) یہ وہ لوگ ہیں جو کرایہ کی نماز پڑھتے ہیں' مگر وہ دوسرے لوگ' ٹھیکوں پر نماز پڑھتے ہیں اور روزہ رکھتے ہیں۔ مثلاً ایک سال کی نماز..... (۱۰۰ تومان میں' ایک سال کا روزہ دو سو تومان میں..... یہ وہ لوگ ہیں جو ان لوگوں کے کام آتے ہیں جن کے پاس دوران زندگی

عبادتوں کے لئے وقت نہیں تھا مگر پیسہ تھا کہ جسے ان کے ورثاء پیشہ-ور نماز پڑھنے والوں اور روزہ رکھنے والوں کو دیں تاکہ وہ ان کی اس کمی کو پورا کریں- اس پیسے کا بیڑہ غرق ہو کہ جو خدا کے کارخانے میں بھی کام آتا ہے اور کیسے کام آتا ہے! عبادت اور پرستش کا جانشین بن جاتا ہے! اور سرمایہ دار جس طرح اپنی دنیا کے لئے کام نہیں کرتا تھا اور بیٹھا کھاتا تھا اور کام کے لئے لوگوں کے بازو خریدتا اور زر سے مزدوروں کا خون چوستا تھا (گویا ان کا استثمار کرتا تھا) اور پیسے کے زور پر دوسروں سے کام لیتا تھا اسی طرح اپنے دین کے لئے مذہبی پرولٹروں یا مشقت کشوں کو لیتا ہے اور روزے کے پیٹ' اندام نماز اور قرآن کی زبان کو خرید لیتا ہے اور روپیہ خرچ کرتا ہے تاکہ دوسرے اس کی جگہ اللہ کی پرستش کریں اور وہ راہی بہشت ہو اور قیامت کے دن عبادت گزاروں کے روزے' نماز اور قرآن کی تلاوت کے ثواب کو اچک لے-

دین کا استثمار! یاللعجب! دنیا مزدوروں اور دھقانوں کے استثمار سے فریاد بہ لب ہے اور یہ لوگ خدا کو بھی استثمار کر رہے ہیں- (۱)

۱- استثمار' استعمار کی ایک قسم ہے- اس عمل میں چوہے کی صفت کو پیش نظر رکھا گیا ہے اور قارون سے اس کی نسبت دی گئی ہے-

وہ بھی دین کے نام پر!

یہ تمہاری ہڈی کا گودا بھی باہر کھینچ لیتا ہے!!

ہاں..... تو میں کہہ رہا تھا' یہ مشہد ہے اور بقیہ حصہ بھی' قبروں' گورکنوں اور ان کے اسباب و آلات کی آماجگاہ ہے' تاہم زیادہ بہتر صورت کے ساتھ۔ اور شہر کا وہ اونچی سوسائٹی والا حصہ تو العیاذ باللہ من الوسواس الخناس' الذی یوسوس فی صدور الناس طبیعت کو متغیر کرنے والا ہے بالکل اس شخص کی طرح ہے کہ جو گلے سڑے کھانے کو نوش جان کرے اور ایک مدت بعد اگل دے اور اس اگلے ہوئے کو مدتوں بعد کوئی دوسرا یہ سمجھ کر کہ اسے کسی محترم یورپی آدمی نے اگلا ہے کھچڑا یا فروٹ جیلی کے انداز میں تناول کرے اور پھر مدتوں بعد وہ بھی اسے اگل دے! اب اس کیفیت کی اگلی ہوئی شے کو آپ اپنی نظروں سے گزاریئے۔

آپ کی کیفیت کیا ہوگی' آپ کس عذاب سے گزریں گے۔ شہر کے اس صاف ستھرے اور ہشاش بشاش لوگوں کا یہ علاقہ..... نہیں' میں کچھ نہیں کہوں گا۔ قلم کی حرمت جاتی رہے گی اور وہاں کے ان غریب لوگوں کا داغ تازہ ہو جائے گا جو مختصر تعداد میں محنت مزدوری پر گزارا کر رہے ہیں جو ان پھُرتیلے انسانوں کی یاد تازہ کر رہے ہیں جو

بیل کی جگہ کولہو میں جوتے جاتے تھے۔ جو ان آوارہ ہرنوں کی طرح ہیں کہ جنہوں نے اپنے ضامن کی پناہ لے رکھی ہے۔

اس کے وہ آبرومند طلبہ کو جو اربوں کی موقوفات اور لاکھوں دینی رقومات کے سایہ میں بھوک پر گزارا کررہے ہیں۔ (۱) ایک امریکی مرغ سے بھی کمتر رقم سے اپنا خرچ چلا رہے ہیں اور اس زمانے میں جس میں کہ ایک ترقی پسند انسان اپنے علمی موضوع کو قومی آمدنی کی بنیاد پر انتخاب کررہا ہے وہ امام جعفر صادق علیہ السلام کی ثقافت کو قائم رکھنے کے عشق میں ایک پر مشقت زندگی گزار رہے ہیں۔ انہیں اپنی جوانی ان حجروں میں بسر کرنی پڑتی ہے کہ جو انتہائی تنگ اور رطوبت زدہ ہیں۔ انہیں اپنے کمال اور اپنے بڑھاپے کو اپنی پارسائی کی نذر کرنا پڑتا ہے اور ان کے ایمان کو عوام قریب لوگوں کا بازیچہ بننا پڑتا ہے اور علم کو بھی عوام کی تشخیص کا سامنا ہوتا ہے' اس سے بڑھ کر اور کیا مصیبت ہو سکتی ہے؟

اور نیز اس حوزہ کے وہ خاموش پاک نہاد لوگ کہ جو اب تک ہماری ثقافت کے بلند پایہ علماء کی سنت کے محافظ ہیں' اور اس کے عالی دماغ دردمند لوگ اور وہ گروہ جو اس کا دلدادہ ہے اور اس کے

۱- خیال رہے کہ علی شریعتی کی یہ گفتگو ایران کے اسلامی انقلاب سے پہلے کی ہے۔

شجاعت شناس مردانِ نرکہ جنہوں نے سفلہ پروری کے اس چلن میں ابھی تک مردانگی کی نشانی کو اپنے ساتھ رکھا ہوا ہے!

ہاں تو میں اپنے آپ سے کہہ رہا تھا! یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے' پھر کیسی توقع؟ جب تک یہاں کے بیشتر فضلاء کسی کتاب کو پروسپیکٹس میں یا پھر اپنی گفتگو یا اپنے عملیہ کے رسالوں میں خریدنے کی تاکید نہیں کرتے اور وہ لوگ کہ جن کی بات "فصل الخطاب" ہوتی ہے (یعنی حکم کی حیثیت رکھتی ہے) ان کو حکم نہیں دیتے کہ فلاں کتاب انتہائی پر مغز اور عمیق ہے! یا حضرت "ہرمان آتہ" یا جناب لارڈ ایوبری جیسے ان کے عالی قدر مراجع' خاص طور پر علوم شرقی اور علوم اسلامی سے منسلک اور اِذن یافتہ آیتِ عظماء' مفتی اعظم اور قائدِ معظم' تقلید کے مرجع عالی' جلالتماب استاد حضرت اڈورڈ براؤن طاب ثراہ مرحوم فتویٰ صادر نہ کرے کہ فلاں کتاب کو پڑھئے' فلاں شخص بڑے پایہ کا محقق و مصنف ہے' اس کی حمایت کیجئے..... یا پھر "ہیکلِ اعلیٰ" "بابِ ابہا" اور نقطہ اولیٰ سے علامہ تقی زادہ' علامہ بدیع الزماں فروزانفر اور علامہ..... (حرمت کلام کی رعایت کے پیش نظر ان کے نام سے اجتناب کیا جاتا ہے) جیسے "نواب خاص" اور "ابواب اربعہ" سے کوئی لوح نہ پہنچے کہ فلاں اثر کو مقیض و محکم'

فلاں نثر کو سلیس، فلاں شعر کو فصیح اور فلاں سبک کو نامرغوب مانو۔

(۱) یا پھر جب تک سال کے انعام یافتہ کتاب کی مہر اس پر نہ لگ جائے یا اس کا لکھنے والا کوئی علامہ یا اس کا کوئی فبریکی (یا نہیں تو دستکار) چوزہ نہ ہو کہاں سے کوئی سمجھے گا کہ یہ ایک اچھی کتاب ہے۔ ان بیچارے افراد کو غیب کا علم تو نہیں ہے! مقلد، اجتہاد کا حق نہیں رکھتا۔

مثلاً بدنصیب غلام ابول کہ جس کا لقب شا غلام ہے اور جو اطراف کے دیہات میں ایک دیہات کا مُکھیا ہے اور پورا گاؤں اس کی زیر پرورش ہے جب خریداری کے لئے تہران آتا ہے تو کہاں سے یہ بات اسے معلوم ہوگی کہ مثلاً مرحوم استاد بدیع الزماں فروزانفر نے چونکہ فلاں ناشر سے معاہدہ کرلیا ہے اور علمی، ثقافتی اور فنی کاروباری

۱- اور اس کی مثال صائب کے اشعار اور اس کا سبک ہے کہ چونکہ انہوں نے فرمایا کہ یہ "سبک ھندی" ہے، ان لوگوں نے بھی یہ جانتے ہوئے کہ یہ اصفہانی (سبک) ہے سرے سے اسے ہندی کہا۔ چونکہ انہوں نے اس سبک کو پسند نہیں کیا اور کہا کہ یہ ایک نامرغوب سبک ہے۔ ان لوگوں نے بھی اس بات پر اجماع کرلیا کہ یہ ایک نامرغوب یا غیرپسندیدہ سبک ہے اور سب کے ذائقہ نے ایک ساتھ اسے رد کردیا اور اس کے نتیجے میں قاآنی اور سروش کے اشعار "رنائسنس" اور صائب کے ارتجاعی اور قرون وسطیٰ کے ہوگئے۔

ادارہ سے ان کا عہد و پیمان ہے کہ وہ کوئی کتاب مثلاً شیخ عطار کی سوانح حیات تصنیف کریں گے اور اپنے ہر علمی تحقیق، معنوی افکار اور عرفانی اغراق پر مشتمل صفحہ کے مثلاً ۵۰ تومان معاوضہ لیں گے لہٰذا مجبور ہیں کہ وہ اپنی اجرت کی سطح اونچی کریں اور اِدھر اُدھر کی باتیں جس قدر ممکن ہو اس میں بھریں اور اتنی ہوا باندھیں کہ وہ پھول کر ۵۰۰ صفحے کی ہوجائے اور دو ہزار پانچ سو ریال سکہ رائج الوقت میں اختتام کو پہنچے، اور اس میں ریزگاری کا حساب نہ بنے اور حضرت شیخ، علامہ، عارف، سالک اور..... کیا عرض کروں، کی روحانیت معنویت اور کرامت وغیرہ کے مناسب حال ہو۔

یا جانے کہاں سے تہران کے ایک دوسرے گوشے میں ایک بوڑھا پشتِ زمین پر آبیٹھا ہے کہ جس کا نہ کفر معلوم ہے اور نہ ایمان، نہ دنیا ہے اور نہ دین، جس نے اپنی تمام عمر علمی امور، حق اور حقیقت بینی، قدیم سنتوں کے احیاء اور "آھورائی" (۱) دائمی آگ کو پھر سے روشن کرنے میں گزاری ہے۔ گرچہ وہ "پورِ داوَد۔" (داوَد کی اولاد) ہے مگر اپنے خاندان کی بدحالی سے برگشتہ ہے اور "پور کیومرث" کو دل دے بیٹھا ہے وہ زرتشت کی آگ کا آتش زدہ اور

۱- آھورا زرتشتیوں کی اصطلاح میں "خدا۔ روح اور حیات" ہے۔

استغنا اور بلندیوں کا مسند نشین ہے۔ اس نے دنیائے دنی سے اعراض کرکے بہشت بریں' حور و قصور اور مہر آفتاب کے سمندر میں غوطہ زن ہے اور خدا اور فرشتوں کے ساتھ محو پرواز رہا ہے۔ اس کی ساری پرورش مقدس آگ اور آفتاب مہرپرستی کی بستی میں ہوئی ہے۔ وہ دین تاباں کا موعود بھی ہے۔ اس وارثِ "گفتار نیک' پندار نیک اور کردار نیک" نے بقول جلال (آل احمد) کے' تیل کے امریکی' فرانسوی' یورپی اور ڈچ وغیرہ پر مشتمل بین الاقوامی کمپنیوں کے Consortium سے متعلق "بیژن و منیژہ۔" (۱) کی کتاب پر ایک مقدمہ لکھا ہے اور اس میں اس نے Consortium کی آریائیت کے مناقب اور "شیل" اور "اویل" کمپنیوں کے درمیان ایک مجہول اور پراسرار رابطے پر قلم فرسائی کی ہے اور اویل کمپنی اور برٹش پٹرولیم کو مثالی قرار دے کر اسے شاہنامہ کے قصے "بیژن و منیژہ" کے عشق سے ملایا ہے اور نیز بتایا ہے کہ ان دونوں کے درمیان آریائی نسل کی قدر مشترک موجود ہے اور Consortium کے تحقیقی ادارے نے استاد کی ہدایت پر اسے حال ہی میں منکشف کیاہے' یہ مقالہ اس قدر مناسب' درست' اہم اور کار آمد نکلا کہ

۱۔ افراسیاب کی بیٹی جس پر بیژن عاشق تھا۔

جس کی اہمیت کو بینک، اسلحے، اور تیل کے سلاطین نیز عالمی حیلہ گر اور اندھیرے، پلیدی، اور شروفساد کے شیطانی مظاہر تک نے پرکھ لیا اور منیژہ سے بیژن کے عشق کی طباعت کی ضرورت کو پٹرولیم کی کمپنی نے متعین کیا اور اس کارنامے اور حق الکشف کے صلہ میں اسے پچاس ہزار تومان بھی دیئے اور احتمالاً" درپردہ اور بھی انعامات سے اس کی پذیرائی ہوئی.....!

ہاں، تو اب تہران چلتے ہیں۔ یہ سواد اعظم کی جگہ ہے۔ شاید یہاں کچھ ایسے آدمی بھی ہوں کہ جو آپ خود اپنی پسند سے کتاب پڑھتے اور سمجھتے ہوں اور ایسی کتابوں کی تشخیص کی جرات بھی رکھتے ہوں کہ جو اوپری سطح سے نہ آئی ہو اور جس کی گہرائی اور افادیت کا حکم صادر نہ ہوا ہو۔

میں نے "سلمان" کے ساتھ راہ سفر اختیار کیا اور تہران پہنچا۔
لیکن اپنے آپ سے کہا : میں علم و دین و اخلاق کے گھرانے کا پروردہ ہوں۔ میں نے فقر میں عزت کے ساتھ زندگی گزاری ہے اور عمر کے اس حصے تک سیدھی راہ چل کر آیا ہوں، اور سچائی، کتاب اور آزاد منشی کے ساتھ وفادار رہا ہوں۔ میرے لئے یہ ٹھیک نہیں ہے کہ میں دانائی دکھانے، اچانک ابھرنے اور مارکیٹ کو ہاتھ میں لینے کے

لئے نامناسب کاموں کو اپناؤں۔ اگر خدا چاہے تو اس صحیح اور مشروع راہ سے بھی کسی مقام تک پہنچا جا سکتا ہے' اس مقام تک نہیں کہ جس پر سالکان طریق پہنچتے ہیں اور اس فریق کو انتخاب کرتے ہیں' بلکہ اس مقام پر کہ جہاں انسان کا علم' اس کی مشقت' اس کی ہوشمندی اور اس کی آزاد منشی اور فداکاری' اس کے لئے وبال نہ ہو اور وہ اپنے آپ کو بدنصیبی اور بدنامی سے محفوظ رکھ سکے اور نام و نان نہ سہی کم از کم ان چیزوں کے لئے کسی کا مقروض نہ ہو۔

اسی لئے میں نے حضرت استاد علامہ--- کے نیچے پاٹ لگانے کے بجائے کہ جس کے بارے میں "توفیق" (رسالے) نے لکھا کہ :

"جناب کئی بار مشروطیت میں شہید ہو چکے ہیں۔" اور ان دوسرے صاحب کے دست مبارک کو چومنے کے عوض کہ جو ۱۳۳۰ شمسی یا اس سے کچھ زیادہ کے عرصے میں بہ یک لخت علامہ ہو گئے۔ یا ان تیسرے صاحب تک رسائی تک تگ و دو کے بدلے کہ جن کے پاس میز بھی ہے اور "مجلّہ" بھی' اور یہ وہ اکسیر ہے کہ جو اصحاب کو زرپوش اور وہ اھریمن ہے کہ جو احباب کو بردوش لیتا ہے' یا پھر ان بزرگوار کے پیرکی شب کی معجز اثر محفل میں راہ ڈھونڈنے کے بجائے کہ جو زر' زن' زور' خوشباشی' افیم' چرس' بھنگ' چنگ' جوا' شراب اور دیگر

بھائیوں اور بہنوں سے مزین ہے اور بابا طاہر کے حوض کی طرح ہے کہ جس میں کُرد ڈبکی لگائے تو عرب باہر نکلے' (میں نے) اپنے آپ سے کہا یہ تمام باتیں میرے شایان شان نہیں ہیں۔ جہنم سے کہ لوگ نہیں سمجھتے اور ترقی پسند لوگ بھی دوسروں سے زیادہ ناسمجھ ہیں۔ ان کے لئے بھی ضروری ہے کہ یہی شبینہ کی محفلیں' احباب کی یہی جماعتیں اور یہی مخفیانہ ہماھنگیاں ان کے لئے بلند پایہ شاعر' صاحب عقل ادیب' محقق علامہ' زبردست قلمکار' صاحب امر مصحح اور بسیار گو مقرر مہیا کرکے ان تک ان کا ابلاغ کرے۔

جہنم سے کہ بعض داڑھی پگڑی والے' امام کا پیسہ کھارہے ہیں اور علماء کے نام پر' نام و نان کو پہنچے ہیں اور آداب طہارت' اقسام نجاسات' نکاح' جماع اور شرعی ذبح جیسے حقائق عملیہ کو شیخ بہائی سے نقل کرنے کے سواء' ان کا اور کوئی کام نہیں ہے۔ یہ لوگ محراب و منبر پر گھات لگائے بیٹھے ہیں کہ اگر کوئی ان کاموں کو جن کا وہ پیسہ لیتے ہیں مفت اور بلا احسان اپنے ذمے لے تو سوچے سمجھے بغیر واویلا اور واسلاما کریں' اس پر تہمت لگائیں' اس کی تکفیر و تحقیر کریں' اور بے علم و بے شعور مولویوں کو اس کے پیچھے لگائیں' مجھے ان باتوں سے کیا کام؟ جہنم میں جائے ایسی شرافت اور ایسا عقیدہ کہ جو مجھے اس اسفل

السافلین میں گاڑ دے اور میں یہاں پڑا پڑا سڑجاؤں۔ کیا ایسے معاملات میں جس چیز کو میں کھود رہا ہوں وہ اس چیز سے زیادہ عزیز نہیں ہے جو مجھے حاصل ہو رہی ہے؟ میں کیوں علم و آزادی و فضیلت کا سوداگر اور جہل و اسارت و رذالت کا دلّال بنوں۔

میں نے کہا' میں یہ راستہ اختیار نہیں کروں گا۔ یہی آزادانہ اور قلندرانہ راہ بہتر ہے' خواہ وہ کتنی ہی سنگلاخ' پُرہول' پریشان کن اور تکلیف دہ کیوں نہ ہو۔

میں اپنے ایک ہم خیال جاننے والے سے ملنے نکلا کہ جس نے اپنی ساری زندگی اور اپنے سارے سرمایہ کو ترویج دین مبین' تنویر افکار اور خلق خدا کے ایمان کی تقویت کے لئے وقف کر رکھا تھا' اور خدا کی خدمت کی غرض سے اس نے نشرو اشاعت کا ایک ادارہ کھول لیا تھا اور سوائے ترقی پسندانہ اور روشن فکرانہ مذہبی کتابوں کے اور کوئی کتاب نہیں چھاپتا تھا اس لئے کہ اس کی نیت للہ تھی للدنیا نہیں!

مجھے غائبانہ طور پر اس سے بڑی ارادت تھی اور وہ بھی مجھ پر بہت مہربان تھا۔ اس کے چہرے پر خشخشی داڑھی تھی اور ظاہر ہوتا تھا کہ یہ از روئے ریا و فریب نہیں ہے۔ بس یہی تھا کہ وہ (داڑھی رکھ کر) گناہ کبیرہ سے بچا رہے اور داڑھی سے خلوص بھی اپنی جگہ باقی

ہو۔ اس کی عقیق کی انگشتری اور دل کو موہ لینے والی پرتپاک اور پرخلوص مسکراہٹ، جس سے تقویٰ کا نور، دین کی پاکیزگی اور الہام کا مقدس رنگ جھلکتا تھا۔ ہر اس ملنے والے کو متاثر کرتا تھا جو اس مسکراہٹ کے زیر اثر آتا تھا۔ بہرحال میں اس کے پاس پہنچا، اور رسمی گفتگو کے بعد معاشرے کی برائیوں، اخلاقی قدروں کی پامالیوں، دین کے اضمحلال، قرآن کی مظلومیت، روشن فکروں کی سستی، کہ دین ہاتھ سے جارہا ہے اور وہ بیٹھے دیکھ رہے ہیں، نیز تجدد مابی یا ماڈرنائیزیشن، یورپ کی تقلید، وہ ساری مصیبتیں جس میں اس وقت اسلام مبتلا ہے، جیسے منی اسکرٹ کا رواج اور اس سے زیادہ شرمناک میکرو منی اسکرٹ، انگیا کا عدم استعمال، رقص اور پارٹی کی اوٹ میں منعقدہ محافل اور نہ جانے کن کن امور پر گفتگو ہوئی..... میں نے دیکھا کہ نہیں، وہ واقعی اہل درد ہے، اس کا دل کباب ہے اور خلق خدا کی پریشانی اور خالق کی فراموشی کے سلسلے میں اس کا سوز نہاں، اس کی گفتگو سے ظاہر ہورہا ہے۔ میں نے سمجھ لیا کہ یہ ایک سوداگر نہیں بلکہ بلا کسی لالچ کے دین اور بنی نوع انسان کا خادم ہے، اور اہل علم اور سچے عقیدہ و اخلاص کا مالک ہے۔ علاوہ ازیں اہل فضل بھی ہے، اور قدیم و جدید علوم سے بھی واقفیت رکھتا ہے۔ اس نے قدیم

اسلامی علوم کو "امابعد" اور جدید مغربی علوم کو جراثیم اور آکسیجن تک پڑھا ہے اور فرانسیسی زبان کو بھی "مرسی" اور شاید "کلک شنز کم سا" تک جانتا ہے!

میری امید بڑھی، اور میں نے اپنی رقت آمیز داستان حیات اور کتاب سے متعلق اپنی مشقت و جانفشانی کی داستان اسے سنانی شروع کی اور میسینیون کی عظمت کو بڑی تفصیل سے اس پر آشکارا کیا اور آزادی، سچائی، علم اور اہل مشرق و اسلام پر اس کے حق، اور اس کتاب پر اس کی زحمتوں کو واضح کیا اور اس کی اہمیت بتائی اور اس قرض کا ذکر کیا کہ جو مسلمان جیسی شخصیت کے سلسلے میں خاص طور سے ہم ایرانی شیعوں پر لاگو ہے۔ اور پھر کتاب کے ترجمے وغیرہ کے بارے میں بڑی تفصیل سے گفتگو کی..... پھر جب میں نے حالات کو موافق دیکھا اور ان صاحب کے موڈ میں شگفتگی پائی تو وہ کتاب انہیں نکال کر دی کہ لیجئے یہ ہے وہ کتاب جو اس مصیبت میں گرفتار ہوگئی ہے اور مجھے خوشی ہے کہ بالا خر وہ ایک ایسے شخص کے پاس پہنچی ہے جو.....

اس نے کتاب کو ہاتھ میں لیا اور سب سے پہلے جلد کی پشت پر اس کی قیمت دیکھی۔ جونہی اس کی نگاہ ساڑھے چھ تومان پر پڑی، اس کی بھویں تن گئیں، ہونٹ ابھر کر باہر آگئے اور کچھ دیر کی محققانہ

خاموشی کے بعد وہ اچانک دکان کے عقبی حصے میں گیا اور وہاں سے دو باٹ لاکر ترازو کے پلڑے میں رکھے اور پھر "سلمان" کو دوسرے پلڑے میں رکھ کر تولا' میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی گیلے جھاڑو سے میری پشت پر ضرب لگا رہا ہو اور عالم وجود کے تمام ذرات میرا مذاق اڑا رہے ہوں' آسمان منہ' ہونٹ اور ٹھوڑی بگاڑ کر مجھے چڑا رہا ہو' در و دیوار میری توہین و تحقیر کر رہے ہوں..... میں کیا بتاؤں کہ میری حالت کیا ہوئی۔ مجھ پر اس شخص کے جذبات کا سا عالم تھا کہ جو اپنے لخت جگر کو شدت غربت و بیچارگی میں کسی موٹی گردن والے سود خور سرمایہ دار کے ہاتھوں فروخت کر کے کھڑا دیکھتا ہے۔ نہیں' میری کیفیت اس سے بھی زیادہ سخت تر اور زبوں تر تھی۔ میں اس دکاندار کے سامنے اپنی کیفیت کو الفاظ میں نہیں بتا سکتا جو میسینیون' سلمان' مجھے اور میری کتاب کو تول رہا تھا تاکہ ہماری قیمت کا تعین کر کے بتا سکے کہ ہم چند لوگ اس زمانے میں ساڑھے چھ تومان کے بھی نہیں ہیں' اگر کوئی ساڑھے چار یا زیادہ سے زیادہ پانچ تومان میں بھی ہمیں خریدے تو گویا اس نے اچھی خریداری کی ہے!

میں دکان چھوڑ کر باہر آیا۔ یہ سارا پلید و ناپاک سواد اعظم

میرے سر کے گرد دیوانہ وار گھوم رہا تھا۔ میرے سامنے سے گزرنے والے سارے آدمی، سارے جوڑے، سارے جتھے کہ جن میں ہر کوئی اپنے خیال میں مگن تھا میرے دل کو نفرت و کینہ کی آماجگاہ بنا رہا تھا۔ خاص طور پر پوز مارتی ہوئی وہ ہنستی بولتی لڑکیاں جن کے دل گدگدا رہے تھے اور انہیں اس بات کی خوشی تھی کہ مثلاً انہوں نے اپنے زانوؤں کے اوپری حصے کے بہت سے قابل توجہ حصے کو عابدین کی نگاہ کی زد پر لانے میں کامیابی حاصل کی ہے یا وہ لڑکے کہ جو جلاب زدہ افراد کی طرح بار بار آجا رہے تھے کہ کہیں انہیں اپنی نوع کے ان مادنیوں کا چھپا ہوا تحتانی حصہ دکھائی دے۔ یہی وہ لوگ ہیں کہ جنہیں اس بات کی ضرورت ہے کہ مجھے سمجھیں اور میری شناخت کریں اور میں نے ان ہی کے لئے میسینیون کا تعارف کیا ہے! آسودہ حال، ہنستے بولتے مالدار لوگ گویا جان بوجھ کر مجھے اذیت پہنچانے کے لئے میرے سامنے سے گزر رہے تھے۔ ہر موٹی گردن والا اینٹھو خان میرے سامنے سے اس طرح گزر رہا تھا جیسے وہ میرا مذاق اڑا رہا ہو۔ ہر وہ کھانسی کہ جو بڑی خاطر جمعی سے رو بعمل آرہی تھی ایسی گولی تھی جو میری روح میں پیوست ہو رہی تھی۔ ہر قہقہہ میری ہڈی کے گودے کو بھون رہا تھا۔

میں نے اسی عالم میں خیابان شاہ آباد کو طے کیا اور اپنے آپ کو میدان بہارستان میں اس خیال سے کشاں کشاں لایا کہ یہ کھیل کا میدان ہے اور یہاں انسان نما لوگوں کا ہجوم کمتر ہے اور میں یہاں زیادہ سکون سے سانس اٹھا اور قدم لے سکتا ہوں، نہیں میں کیا کہہ رہا ہوں؟ قدم اٹھا سکتا ہوں اور سانس لے سکتا ہوں، اور ان چہروں کو، ان کھانسی کی آوازوں کو، ان اینٹھو خانوں کو تھوڑی دور کے فاصلے سے دیکھ سکتا ہوں اور درد دیدار کو کسی قدر کم کر سکتا ہوں، مگر یہاں تو اور بھی برا ہوا! میدان کے جنوبی حصے میں میری نظر اس بورڈ پر پڑی جس پر لکھا تھا "مرکزی دفتر مطالعات و نظامہای عمل۔" اور پھر مجھے وہ غم انگیز اور مضحکہ خیز دن یاد آئے جب میں ادارہ تعلیم میں ماہر علوم ادارہ تھا، میرا سر پھر چکرانے لگا اور میں نے محسوس کیا کہ میرے بدن کی ساری طاقت سلب ہو چکی ہے اور میں اپنے آپ کو ایک بھاری لاش پا رہا ہوں جسے میرے دو ناتواں کندھے کھینچ رہے ہیں۔ اب میری طاقت جواب دے رہی ہے اور میں گر رہا ہوں۔

میں نے ارادہ کیا کہ اپنے آپ کو دفتری یادوں کی قید سے آزاد کروں اور کہیں اور نکل جاؤں۔

میں نے اپنی آنکھیں، اپنے ارادے، اپنے افکار اور اپنے

احساسات کے ساتھ یک لخت اس عمارت اور ادارے سے متعلق ہر شے سے پھیر لیں۔ مگر بات اور بگڑی' عمارت کے سامنے والے میدان میں میری نظریں پارلیمنٹ ہاؤس پر پڑی اور ساری ساٹھ سالہ یادیں اور اس وقت کے سارے خطرات یکجا طور پر میرے ذہن میں دوڑ پڑے : وہ مردانہ مونچھیں' وہ خاک آلود چمڑے کی ٹوپیاں' وہ ستار خان کا پاک و پاکیزہ اصیل چہرہ' وہ شیخ علی مسیو کی حنائی داڑھی اور معمولی کپڑے کی ٹوپی' وہ تبریز کی نانوائی کے ۱۳۔۱۴ سالہ بچے کہ جنہیں گاڑی میں بٹھا کر شہر سے باہر پھانسی کے لئے لے جایا جارہا ہے اور باپ ان بچوں کو دلاسا دے رہا ہے کہ گھبراؤ نہیں ابھی آدھے گھنٹے میں ہم ان بدذاتوں کے ہاتھ سے چھٹکارا پائیں گے..... اور..... الی زماننا هذا و نحن فیه (اور اسی طرح یہ سلسلہ اس زمانے تک آرہا ہے جس میں ہم ہیں) اور..... آہ..... کہ آج سلمان کو ترازو میں تولا جارہا ہے۔

ان سب یادوں کے درمیان کہ جو "الفرڈ ہیچکاک" کے پرندوں کی طرح میرے سر پر ٹوٹ پڑے تھے' میرے سامنے سے عباس آقای اتابک کا وہ چہرہ نہیں سرک رہا تھا کہ جو پارلیمنٹ کے مقابل والے میدان پر نقش برزمین تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں

کیا کروں' اور کس طرح اس کیفیت سے چھٹکارا پاؤں؟ میں نے اپنے آپ کو اس کینٹین میں پہنچایا جو پارلیمنٹ کے سامنے والے میدان کے موڑ پر تھی اور ایک گوشے میں اپنے آپ کو پارلیمنٹ کی اس چبھنے والی نظروں اور جگر خراش نگاہوں سے چھپالیا جو مجھے اس طرح دیکھ رہی تھیں جس طرح کوئی بھیڑیا ایک تنہا' معصوم' غریب اور ریوڑ سے بچھڑ جانے والے بکری کے بچے کو دیکھتا ہے۔ میں نے وہاں بیٹھ کر جانے کب تک وقت گزارا--- ایک گھنٹے--- گھنٹوں--- یا پتہ نہیں کب تک؟ میں ایک ایسی کیفیت میں تھا کہ جب وقت اپنی طنابیں کھینچ لیتا ہے' زمانہ حرکت نہیں کرتا' ساری چیزیں اور سارا وجود تھم جاتا ہے اور جو چیز جہاں ہے وہیں رہتی ہے۔

رات چھاگئی' کیسی بے رحم اور خشم آلود رات! میں نے کتاب کی کئی دکانوں کا جائزہ لیا اور چند ایک کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا' کتاب خریدنے والوں اور ان کتابوں کے بارے میں تحقیق کی کہ جن کی بکری ہوتی ہے اور یہ معلوم کیا کہ وہ کونسے ہاتھ ہیں جو ان لوگوں کو یہ کتابیں خریدنے کے لئے بھیجتے ہیں..... میں یکسر ناامیدی کا شکار ہوگیا.....

میرے قدم اسلامبول کی "مسجد ہدایت" کی طرف اٹھے کہ جو

بڑی اچھی اور صاف ستھری مسجد ہے اور اس میں نماز پڑھنے والے لوگ بھی بہت صاف ستھرے اور ہدایت یافتہ ہیں اور ان کی اکثریت آج کے ترقی پسند لوگوں کی ہے..... میں نے دل میں سوچا کہ کچھ دیر اپنے آپ کو "سوادِاعظم" کے اس سڑے' بدبودار' کیچڑ سے باہر نکالوں اور مسجد کی خاموش اور روحانی فضاء میں تنہائی اختیار کروں اور اپنے بارے میں سوچوں اور دیکھوں کہ' بہرحال میں اس ملک میں کون ہوں اور کہاں ہوں؟ میری سرگزشت کیا تھی اور سرنوشت کیا ہوگی؟.....

مسجد کے دروازے پر ایک بڑی میز رکھی تھی جس پر کتابوں کو منظر عام پر لایا گیا تھا' اور یہ ایک اچھی بات تھی۔ کتابیں بھی ساری مناسب' مفید اور اچھی تھیں۔ میں نے پوچھا : آپ کے پاس "سلمان پاک" نہیں ہے؟ بوڑھے کتاب فروش کو ایک اچھنبا سا ہوا اور کہا : تمہیں کیا کرنا ہے؟ میں نے عرض کی : پڑھنا ہے! اس نے ایک ایسے لحن میں جو فتوائی سر لئے ہوئے تھا' خیرخواہانہ چہرے' ناصحانہ مسکراہٹ' حکیمانہ گلے' اور اس انداز سے کہ گویا اس کے سارے اعضاء و جوارح میں حکمت بھری ہوئی ہے کہا : "نہیں! یہ ایسی کتاب نہیں ہے جو آپ کے کام آئے!" اس کے بعد وہ گہری

خاموشی میں چلا گیا اور کچھ نہیں کہا۔ میں نے پوچھا : کیوں؟ اس نے ایسی کیفیت میں جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے اس بارے میں مزید وضاحت سے اکراہ ہے اپنے اوپر جبر کر کے بڑی کراہت' بے دلی اور ایک عالمانہ خستگی کے ساتھ کہا : "جی..... اس کے مترجم نے ایسی باتیں کہی ہیں کہ جو اصول و حقائق..... جی ہاں..... اس طرح..... جیسے..... ہاں..... مناسب نہیں..... یعنی..... غلط ہے..... حقیقت سے دور ہے..... مناسب نہیں کہ نوجوان طبقہ اسے پڑھے....." اس کے بعد گویا اس میں کسی قدر گرمی آگئی اور طراوٹ میں آکر کہا اسکا لکھنے والا ایک غیر ملکی شخص ہے اور پھر بنیادی طور پر غیر ملکی حضرات ہمارے سلمان کو کہاں سے سمجھ سکتے ہیں؟ ایسی ویسی باتیں وہ بھی ہماری کتابوں سے اکٹھی کر کے اس میں اپنی غرض کو شامل کر لیتے ہیں اور ہمارے نوجوان سمجھتے ہیں کہ جو کچھ باہر کے لوگ لکھتے ہیں وہ صحیح ہے!..... جی ہاں..... اور یہ مترجم بھی ایک نوجوان آدمی ہے..... البتہ اچھا ہے مگر..... کیا کہوں....." میں نے عرض کی' کیا آپ اس کے مترجم سے واقف ہیں؟ اس نے ایک معنی خیز پر سکون مسکراہٹ لبوں پر بکھیر کر کہا : کیوں نہیں' اسے اور اس کے باپ کو اچھی طرح جانتا ہوں' میں نے عرض کی کہ وہ بھی ایک اچھا نوجوان ہے' میرا دوست بھی ہے۔ یقیناً" شاید اسے توقع بھی نہ ہو کہ عالم

رفاقت میں..... مگر یہ مذاق بات نہیں ہے۔ یہ حق و باطل کا مسئلہ ہے' دین کا معاملہ ہے۔ میں نے اسے صریحاً" کہا۔ اور اس کی اشاعت سے قبل بھی کئی بار تاکید کی کہ دیکھو تم اس پر قلم نہ اٹھاؤ! یا کم از کم اس میں کوئی تبدیلی پیدا کرو جو ہمارے عقائد کے مناسب حال ہو۔ البتہ اس نے کسی حد تک میری یہ بات سنی اور اس میں کچھ دستکاری دکھائی اور اصلاحات بھی کیں لیکن پھر بھی کچھ نہیں ہوا....."

میں نے عرض کی' آپ نے خود اس کتاب کا گہری نظروں سے مطالعہ کیا؟ اس نے کہا' "کسی حد تک یقیناً"..... میں نے بہت پڑھا' کئی بار..... اور پھر ان (مقدس ریش والے فرانسیسی داں) صاحب نے بھی مجھے بتایا کہ مترجم نے لکھا ہے کہ پیغمبر اسلام خود اپنے ہاتھوں سے جان بوجھ کر مسلمانوں کے درمیان اختلاف پیدا کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ مسلمان ہمیشہ ایک دوسرے سے علیحدہ رہیں اور ان میں تفریق پیدا ہو اور وہ ایک دوسرے کے دشمن ہوں! پیغمبر نے خود یہ کام کیا!؟" حالانکہ پیغمبر اسلام ہمیشہ مسلمانوں کو ایک دوسرے کا بھائی سمجھتے تھے۔ انما المومنون اخوہ! کا مطلب کیا ہے؟ یعنی مسلمان سب ایک دوسرے کے بھائی ہیں' حقیقی بھائیوں کی طرح' بلکہ بھائیوں سے بھی زیادہ بھائی! کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ بھای بھائی کا دشمن ہو؟ یا

پھر وہ دوسری آیت' جی..... اس وقت ذہن میں نہیں آرہا..... جسے' (میری کتاب کو ترازو میں رکھ کر تولنے والے) جناب فلاں نے قرآن مجید سے ارشاد فرمایا' : جی ہاں..... اعتصم!..... یعنی اپنے ہاتھوں سے اسے تھام لو..... جی..... "اعتصم بالقرآن ولا اختلفوا" (غلط آیت گڑھ کر پڑھی)..... یعنی کیا؟ یعنی آپ سب لوگ ہاتھ سے ہاتھ ملائیں' ایک دوسرے کے ساتھ مصافحہ کریں۔ دو بھائیوں کی طرح قرآن کے سائے میں اپنے ہاتھوں کو گرمجوشی سے ملائیں' یا قرآن کو بھائیوں کی طرح ہاتھ میں لیں..... جی ہاں..... (میری کتاب کو ترازو میں تولنے والے) جناب فلاں نے کتابوں سے بہت سی آیتوں اور راویتوں کو پڑھا اور یہ ثابت کیا کہ تمام مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ ان میں اتحاد و اتفاق ہو' وہ بھائی چارگی کی فضاء کو قائم کریں۔ اختلاف اور دشمنی کو پاس نہ آنے دیں اور ایک دوسرے کے ساتھ محبت و اخوت کا رشتہ قائم رکھیں۔ میں خود (یعنی مسجد والا کتاب فروش) ایک دن اس کی دکان پر تھا کہ اس نے ٹیلیفون کے ذریعے آیت اللہ اوقیانوس العلماء سے پوچھا کہ ایک کتاب میں لکھا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم عمدا" مسلمانوں کو ایک دوسرے سے لڑواتے تھے' اور ان کو یہ بات پسند تھی کہ اسلامی معاشرے میں ہمیشہ

تفرقہ اور دشمنی پھلتی پھولتی رہے' اس کتاب کے لکھنے والے اور اس جیسے دوسرے لوگوں کے بارے میں ہمیں آپ کا نظریہ مطلوب ہے تاکہ لوگ اس مسئلہ میں اپنی تکلیف شرعی سے واقف ہوں؟.....

مذکورہ آیت اللہ کہ جو بڑے صاحب مرتبہ ہیں اور انجیر کے پیڑ والی مسجد میں ۳۰ سال سے نماز پڑھا رہے ہیں اور جو مرحوم آیت اللہ آقا سید ابوالالبر اصفہانی' رشتی مازندرانی ثم استر آبادی (گڑھا ہوا طنزیہ نام) کے نمائندے رہے ہیں اور میں انہیں اچھی طرح جانتا ہوں اور بیس سال تک انہیں دوروں پر لے جاتا اور لاتا رہا ہوں اور گویا ان کے گھر کا ایک فرد ہوگیا ہوں' ان کی اہلیہ ۳۷ سال سے ان کے پاس ہے اور آپ یقین نہیں کریں گے کہ ایک دن بھی اس نے اپنے گھر سے باہر قدم نہیں رکھا حتیٰ کہ شہزادہ عبدالعظیم کی زیارت کے لئے بھی گھر سے باہر نہیں نکلی!! صرف ایک بار ایسا ہوا کہ وہ زیارت عاشورہ پڑھنے کے لئے چھت پر گئی اس لئے کہ زیارت عاشور زیر آسمان پڑھنا مستحب ہے اور (عالمانہ لحن سے) ہمارے پاس اس کی روایت بھی ہے! جب آقا صاحب کو اس کا علم ہوا تو وہ اس پر بہت برہم ہوئے اور اپنی بیوی سے ایک مہینے تک بات نہیں کی..... جی.....

ان کے بڑے واقعات ہیں۔ وہ خود بھی اتنے متقی ہیں کہ جب کبھی

طلحہ کا نام آتا ہے اس کی تای تانیث کو بالجہر ادا نہیں کرتے ان کا چہرہ شرم سے سرخ ہوجاتا ہے اور پینے کے پانی کی ضرورت پڑتی ہے..... سہم امام جو انہیں ملتا ہے اسے خرچ نہیں کرتے، مثل آیت اللہ..... کلباسی (فرضی نام) کے، دور کہیں جاکر کسی غار کے شگاف میں تہ خاک چھپادیتے ہیں تاکہ جب امام علیہ السلام کا ظہور عمل میں آئے تو وہ خود (جو اس رقم کی جگہ کو جانتے ہیں جاکر اٹھالائیں! جی..... وہ (میری کتاب کو ترازو میں تولنے والے) اس شخص کے جواب سے اس قدر ناراض ہوئے کہ ٹیلیفون پر ان سے بولا نہیں جارہا تھا، فقط یہی الفاظ ان کی زبان سے نکلے : کفرہے، کفرہے! بیہودگی ہے! کون ان..... (نازیبا لفظ) ------ کو اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ وہ دینی امور میں دخالت کریں۔ اور ان بے لحاظ لوگوں کو دیکھو کہ جو اپنے دینی مسائل کو ہم علماء سے پوچھنے کے بجائے کہ جنہوں نے ایک عمر مدرسوں کے کمروں میں چراغ کا دھواں پی پی کر گزارا ہے ان کتابوں کے پیچھے دوڑتے ہیں جنہیں فلاں روس کے آرمنی عیسائی، فلاں بدعقیدے اور لامذہب نصرانی وغیرہ نے لکھا ہے اور فلائی ٹائی پوش، بے داڑھی مونچھ کے ناپاک آدمی نے ترجمہ کیا ہے! واقعی دور آخرالزماں ہے، روایت میں ہے کہ ایک ایسا زمانہ آئے گا جب

عورتیں مردوں کا اور مرد عورتوں کا لباس پہنیں گے۔ عورتیں چوبی گھوڑوں پر سوار ہوں گی (میرا استنباط ہے کہ اس سے مراد یہی سائیکلیں اور گاڑیاں ہیں) اور بہت قرائن و علامات اس بات کی نشاندہی کررہے ہیں کہ وقت ظہور انشاء اللہ قریب ہے اور پھر آقا صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ رطوبت والے ہاتھوں سے اس کتاب کو چھونا بھی جائز نہیں ہے۔ حتیٰ کہ جب (میری کتاب کو ترازو میں تولنے والے) ان صاحب نے عرض کی : اجازت ہو تو میں اس کتاب کے ایک نسخے کو مطالعہ کے لئے آپ کی خدمت میں پیش کروں تو پہلے تو انہوں نے فرمایا کہ : "احوط یہ ہے کہ اس کی جواز توانائی خالی از اشکال ہے" لیکن پھر فورا" غصے میں فرمایا کہ : "نہیں' ایسی کتابوں کے مطالعہ سے کراہت ہے۔"

میں نے کہا تاہم اچھا تھا کہ آپ اس کتاب کے کچھ نسخے اپنے پاس رکھتے تاکہ بعض افراد اسے پڑھ کر دیکھتے کہ وہ کیا ہے؟ اس نے کہا : "جی ہاں..... مگر (میری کتاب کو ترازو میں رکھ کر تولنے والے) اس کتاب فروش نے مجھے اس کی اجازت نہیں دی۔

میں نے چند ایک دن اس سواد اعظم میں رہ کر گزارے اور دیکھا کہ (میری کتاب کو ترازو میں رکھ کر تولنے والے) اس کتاب فروش

نے میری کتاب کو شہر کی تمام دکانوں سے اکٹھا کرکے سب کو تاکید کی کہ اس کتاب کو رکھنے اور بیچنے سے اجتناب کریں اس لئے کہ یہ دینی اور علمی اعتبار سے مضرت رساں ہے' اس کے بعد میں نے کئی ڈاکٹروں' انجینئروں' پڑھے لکھوں' روشن فکروں' دیندار لوگوں' یورپ کا دورہ کرنے والے مفکروں' مدرسوں کے سرپرستوں اور ترقی پسندوں سے ملاقات کی۔ میں نے دیکھا' ملاقات کے پہلے مرحلے ہی میں' ان میں سے ہر ایک کبھی شکایت آمیز لحن میں' کبھی مذمت بھرے انداز میں' اور کبھی معنی خیز اور تعجب آمیز صورت کے ساتھ میری کتاب کو تنقید کا نشانہ بنا رہا ہے۔ اور وہی کچھ کہہ رہا ہے جسے میری کتاب کو ترازو میں تولنے والے کتاب فروش نے کہا تھا اور اسی لقمہ کی جگالی کر رہا ہے جسے اس نے ان متدین روشن فکروں کے منہ میں دیا تھا کہ جنہیں نہ مغرب منظور ہے اور نہ مشرق' اور جو یہ چاہتے ہیں کہ ایک نئی بشریت کو جنم دیں اور ایک تازہ مدنیت کی نیو ڈالیں۔ میں نے ان میں سے جس سے بھی پوچھا : "آپ نے یہ کتاب پڑھی ہے؟" اس نے کہا : "نہیں' مگر..... فلاں انجینئر صاحب فرما رہے تھے کہ انہوں نے فلاں ڈاکٹر سے سنا کہ فلاں حاجی آقا صاحب کسی مجلس میں تھے کہ وہاں کسی نے (کہ جو یقیناً" وہی کتاب فروش رہا ہے

کہ جس نے میری کتاب کو ترازو میں رکھ کر تولا تھا) اس کتاب کے بارے میں گفتگو کی!

ان سارے پڑھے لکھے ترقی پسند زندہ آدمیوں میں، میں نے خود نہیں دیکھا، مگر سنا کہ تعلیمات کے شعبے سے تعلق رکھنے والے فقط دو افراد ایسے تھے جن کی گفتگو گو کہ منفی اور میرے حق میں نہیں تھی مگر ذاتی مطالعہ کی بنیاد پر تھی اور اس راہ سے مختلف تھی جسے اس عقیق کی انگشتری پہننے والے کتاب فروش نے اختیار کر رکھا تھا۔ ان میں سے ایک ادبیات کا استاد تھا اور جہاں اس کتاب اور اس کے مترجم کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی وہاں اس نے کہا : "ہاں، نہیں، دس گیارہ سال پہلے فلاں شخص، فلاں گرلز ہائی اسکول میں منطق اور فلسفہ کا استاد تھا اور بچے اس کی باتوں کو اسکول میں بھی دہراتے تھے اور اسی کے بارے میں گفتگو رہتی تھی۔ میری بہن اسی اسکول میں اسی سال آٹھویں کلاس کی طالبہ تھی۔ اور جیسا کہ وہ اس کی بعض باتوں کو دوسرے بچوں کی زبانی بتاتی تھی ایسی کوئی بات نہیں نکلتی کہ جس میں اس قدر شور شرابا ہو۔"

دوسرا ادبیات کا استاد تھا کہ جس نے کہا : جی ہاں، جی نہیں بڑا شور مچا رکھا ہے کہ ایسا ہے اور ویسا ہے، نہ بابا، ایک دن میں پرچم

والے جلد ساز کی دکان پر گیا جہاں بچے فلاں شخص کے (یعنی خود اس کے) اسباق کو کیسٹ سے اتار کر اور اس کی فوٹو کاپیاں کر کے جلد سازی کے لئے لائے تھے۔ میں نے وہیں کھڑے کھڑے ایک نظر انہیں دیکھا البتہ عنادین پر میری نظر رہی۔ میں نے دیکھا نہیں' اس میں سرے سے کوئی ربط نہیں ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے تاریخ ادیان اور اس میں بدّھا' کنفیوشس' لاؤتزا اور عیسیٰ علیہ السلام و محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر گفتگو ہوئی ہے۔ اور دوسری جگہ لکھا ہے تاریخ تمدن' اور اس میں مونٹسکیو اور والٹر وغیرہ کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ اور پھر اس کے ایک باب میں قرون جدید' انقلاب فرانس' آرٹ' رنسانس' اور اس قسم کی باتیں ہیں!! ساری گفتگو بے ربط اور بے جوڑ ہے' جی نہیں' جی ہاں! نچ!

ان ہی دنوں' میں لیکچرر شپ کا امتحان دے رہا تھا' جب میں دانش کدہ ادبیات تہران پہنچا تو میں نے دیکھا کہ میری فائل ایک پروفیسر کی میز پر کھلی رکھی ہے اور وہ اس کا مطالعہ کر رہا ہے۔ میں نے اندر پہنچ کر سلام کیا۔ وہاں موجود پروفیسروں میں سے ایک پروفیسر نے جس کو میں اس وقت تک نہیں جانتا تھا اور یہ تشخیص نہیں دے سکتا تھا کہ وہ مذکورہ دو ڈاکٹروں میں' ایک ہے یا کوئی اور ڈاکٹر ہے لیکن میرا

گمان غالب تھا کہ وہ ان ہی مذکورہ دو ڈاکٹروں میں سے ایک ہے' اس پروفیسر سے میرا تعارف کروایا جس کے آگے میری فائل کھلی ہوئی تھی اور ضمناً" یہ بھی بتایا کہ اس کی کچھ تالیفات ہیں..... ان صاحب نے اپنے گلے میں سرخ آندھی والی ہوا بھر کر ایسا پھلایا کہ ان کی صورت ایک نر جنس کے مست فیل مرغ کی سی ہوگئی' اور اپنے اوپر جبر کر کے بڑی مشکل سے اس قابل ہوئے کہ اپنی سخت نگاہوں کو میرے سینے اور گردن کے قریب تک لائیں۔ البتہ پورا زور لگا کر بھی یہ نگاہیں میرے چہرے تک نہیں پہنچیں چہ جائیکہ میری آنکھوں تک پہنچیں کہ جو بطریق اولیٰ محال تھیں۔ اس تکلیف اور اس اذیت کو برداشت کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا: "تم نے فرانس میں ڈاکٹریٹ کیا ہے؟" میں نے عرض کی' جی۔ اس نے ان اساتذہ میں سے کہ جو کمرے کے ایک کونے میں بیٹھے اپنے تیس سالہ کتابچہ کی تحقیق میں اس طرح مستغرق تھے کہ گویا وہ پہلی بار کسی عجیب و غریب متن کا مطالعہ کر رہے ہوں اور ساتھ میں عجلت بھی ان کے گریباں گیر تھی۔ اس لئے کہ کلاس کی گھنٹی بجنے والی تھی' ایک استاد سے مخاطب ہو کر کہا : "کیوں نہیں' ھا! یہ تمام حضرات جو فرانس سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے کر آتے ہیں..... جی..... بڑے ست اور کمزر ہوتے ہیں....." ڈاکٹر..... یا ڈاکٹر..... نے کہا

: ایسا نہیں ہے' یہ نوجوان ایک فاضل شخص ہے اور اس نے ایک کتاب بھی....." موصوف نے فرمایا : جی' بعض افراد لیکچرر شپ کے قریب اپنی اسی تھسیز میں ردوبدل کرکے اسے اپنی تالیفات کے عنوان سے چھاپ دیتے ہیں اور یہ صاحب بھی سارے کلی اصول سے مستثنیٰ نہیں..... میں نے دیکھا' ان کے چشم و ابرو کے درمیان کوئی معاملہ ہے جو طے ہورہا ہے اور اس کے بیچ' میں ہوں کہ جو بسمل ہورہا ہوں' مجھ سے رہا نہیں گیا اور میں چنگاری بن کر اچھلا اور کہا :

جناب استاد محترم' آپ مجھ جیسے سیدھے سادھے انسان کے بارے میں جو حیّ و حاضر آپ کے سامنے کھڑا ہے اور جس کی فائل آپ کے ہاتھ میں ہے' اتنی سنجیدگی' اتنی صحت' اتنے وسواس اور اتنی احتیاط و تحقیق کے ساتھ قضاوت فرمارہے ہیں تو پھر ان تاریخی شخصیتوں کے بارے میں یا ان تاریک اور اہم واقعات کے بارے میں جو ہزار دو ہزار سال پہلے رونما ہوئے..... اس میتھڈ کے ساتھ تو طالب علموں کو سرکار کی تحقیقات اور تاریخی نظریات سے بہت زیادہ مستفیض ہونا چاہئے!..... یہ کہنا تھا کہ اچانک وہ گولی کا نشانہ بننے والے ایک دانشمند کی طرح بڑی زوردار آواز کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھا اور مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اور میں جو اس وقت تک بڑے مودب انداز سے

اس کی میز کے سامنے کھڑا تھا ڈر کر صوفے پر بیٹھ گیا اور پھر ایک سگریٹ سلگائی اور خوفزدہ ہو کر اس سے کہا : میں اس کمرے سے باہر جانے والا نہیں ہوں۔ یہ کمرہ جتنا آپ کا ہے اتنا میرا بھی ہے۔ مگر یہ کہ آپ اپنی دیرینہ عادت کے مطابق عمل فرمائیں..... مختصر یہ کہ جناب استاد میں جو بھی ہوں اور آپ جو بھی ہیں اپنے اس جرم سے بری الذمہ ہونے کے لئے جسے آپ نے مجھ پر عائد کیا ہے میری عرض یہ ہے کہ یہیں جہاں آپ قاضی اور ممتحن ساتھی موجود ہیں میں اس متن کو جس کا میں نے ترجمہ کیا ہے آپ کو دیتا ہوں۔ میں نہیں کہتا کہ آپ اس پورے متن کو پڑھیں میں اس کے ترجمے کو سمجھنے کی بات بھی نہیں کرتا' فقط اور فقط اگر آپ کے لئے ممکن ہے تو صرف اس کے ایک پیرے کو فہم معنی کی توقع کئے بغیر فارسی قرات کے اعتبار سے صحیح پڑھ کر دکھایئے تو میں اپنی لیکچرر شپ سے ہاتھ دھولوں گا اور اسی تیسری منزل کے کمرہ کی کھڑکی سے چھلانگ لگا کر اپنی خیر اور آپ کے شر سے چھٹکارا پالوں گا۔ خدا کی قسم اگر میں نے ایسا نہ کیا تو مجھے مرد نہ کہنا۔

کشمکش نے زور پکڑا وہ' بدزبانی سے' باہر نکل جانے کو کہتا تھا اور میں پڑھنے کو۔ سارے طلباء کلاسوں سے باہر نکل آئے کہ ماجرا کیا

ہے؟ انہوں نے دیکھا کہ ایک بدتمیز نوجوان اس کے محترم استاد سے دست و گریبان ہے اور قابل احترام بوڑھا آدمی بری طرح اس کے چنگل میں پھنسا ہوا ہے۔ سب نے شوق طبیعت میں ھُرّا مارا اور تالیاں بجائیں۔

یہ بھی میرے کالج اور علمی تحقیقاتی اور تفحصاتی ادارے کی بات رہی۔

مگر نہیں آدمی کو بدظن اور ناشکرا نہیں ہونا چاہئے۔ اساتذہ میں سے ایک استاد نے کہ جو مجھ پر مہربان تھے اور میرے دل میں ان کی بڑی عزت ہے' مجھ سے کہا : "استاد مقدم کو آپ کی کتاب سلمان کا بڑا اشتیاق ہے۔ بارہا انہوں نے اس کا ذکر کیا ہے اور وہ اس کی تلاش میں بھی رہے ہیں' اچھا ہے کہ آپ ان سے مل لیں' انہیں بڑی خوشی ہوگی۔" مجھے بھی خوشی ہوئی اور ساتھ میں تعجب بھی کہ یہ بات کیونکر ممکن ہے۔ بہرحال میں ان کے کمرے کی طرف روانہ ہوا' اور دل میں سوچنے لگا کہ اس ملک میں کم از کم ایک فرد تو ایسا ہے کہ جس کو میسینیون کا علم ہے اور جو اس کی زحمتوں کو محسوس کرتا ہے اور سلمان کو سمجھنا چاہتا ہے' جسے میری مشقتوں کا احساس ہے اور جو کتابوں کی اہمیت کو بھی جانتا ہے اور پھر اپنے بارے میں سوچا کہ

بہرحال جس طرح میں سوچتا تھا اس طرح بہت زیادہ اجنبی بھی نہیں ہوں.....

بات بڑی طولانی ہے' آپ کو زیادہ درد سر میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا' مختصراً" یہ کہ ان صاحب کو ان باتوں سے کوئی کام نہیں تھا۔ اس کتاب میں جس چیز کی انہیں تلاش تھی اور جس چیز کو وہ دیکھنا چاہتے تھے فقط ایک جملہ تھا اور وہ جملہ "کردید و نکردید" تھا کہ جسے سلمان نے سقیفہ میں حضرت ابوبکر کے انتخاب کے بارے میں بہ زبان فارسی کہا تھا۔ اور جناب استاد یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ یہ جملہ کن کن صورتوں میں ضبط تحریر میں آیا ہے؟ "کردیت و ناکردیت" یا "کرتیب و ناکرتیت" یا "کرتیدو ناکرتیت" یا "کردید و ناکردید" یا..... اور سب سے زیادہ کھوج اس بات کی تھی کہ اس کی اصلی آواز کونسی ہے؟

اچانک مجھے ہوش آیا اور میں نے دیکھا کہ اپنے بستر پر چت لیٹا ہوں اور اپنے سگریٹ کے دھویں سے..... جسے میں ہر لحہ ایک نئی شکل کے ساتھ فضا میں مجسم کر رہا ہوں..... مصروفِ بازی ہوں اور میری ساری توجہ اس مصروف کن تماشا میں ٹھکی ہوئی ہے اور میں ہر فکر سے آزاد ہوں!

میں نے گھنٹوں اسی عالم میں گزارے' یہاں تک کہ نیند نے مجھے آلیا!

میں کیا کہہ رہا تھا اور کہاں نکل گیا؟

ہاں! جن چیزوں کو مالکیت برداشت نہیں ان میں ایک کتاب ہے۔ کتاب اس کے خریدار کی ملکیت نہیں' کتاب اس کی نہیں کہ جس نے اس کا سودا کیا ہے' پیسہ خرچ کیا ہے اور اسے اپنے گھر کے ریک میں لاچھوڑا ہے۔ کتاب اس کی ہے جو اسے کھولتا ہے' پڑھتا ہے' سمجھتا ہے' درک کرتا ہے' محظوظ ہوتا ہے اور اس سے اثر لیتا ہے۔ یہ اس کی ملکیت ہے کہ جو اس کے جملوں سے زیادہ مانوس ہے' اس کی سطروں سے زیادہ آشنا ہے' اس کے حرفوں سے اس کی روح کا پوشیدہ رشتہ ہے.....

وہ کون دیوانہ ہے جو کہتا ہے کہ مثنوی جناب آقای کربلا حسنی کی ہے کہ جس نے اس پر ساڑھے ستائیس تومان خرچ کئے ہیں اور جلد بندی کرکے اپنے کمرے کے ایک ریک میں رکھ چھوڑا ہے۔ کیا قرآن لیلیٰ باجی کا ہے جسے اس نے "صحن کہنہ" سے گیارہ تومان میں خریدا اور بغل میں داب کر گھر کے اسٹور میں رکھ چھوڑا ہے اور پھر روز آکر اسے چومتی ہے' آنکھوں سے لگاتی ہے' آہیں بھرتی ہے اور چلی جاتی

ہے کہ گویا یہ قرآن اس کا ہے اور وہ اسے بہت زیادہ پسند کرتی ہے!

کیا حافظ کا دیوان اس معذور ٹینکر ڈرائیور کا ہے جس نے اسے ۲۵ ریال میں خریدا ہے اور مئے ناب کی بوتل منہ سے لگانے کے بعد ترنگ میں اس سے فال نکالتا ہے اور حافظ کی پوری کتاب میں اسے صرف "الا یا ایھا الساقی ادر کاسا و ناولھا" ازبر ہے اور اس کے مفہوم کو بھی سمجھتا ہے، یعنی اے ساقی، قربان جاؤں، کاسہ میں مُوتو تاکہ میں اسے نوش کروں!

یہ ٹھیک ہے کہ ان کتابوں پر پیسہ انہوں نے خرچ کیا ہے، مگر.... ہائے کیا کہوں ان لوگوں کے بارے میں کہ جن کے سامنے گدھا، بوعلی سینا ہے!

بات مرحوم سعید نفیسی کی تھی کہ جو اسمبلی کے کتاب خانے کے انچارج بنے..... واہ کیا موج ہے، مُلک کتاب کے فرمانروا، کیسی عظیم اور کس شان کی سلطنت! آدمی کا کوئی معشوق، کوئی معبود، کوئی امام اور کوئی محبوب ہو اور وہ امام، وہ معبود اور وہ معشوق بھی کسی شیلف میں نہ ہو، کسی دربار خلافت میں نہ ہو، کسی سوداگر کے ہاتھ میں نہ ہو، کسی جلاد کی قید میں نہ ہو، کسی مالک کے ہاتھ میں نہ ہو اور..... وہ خود اس کا متولی ہو، خود اس کا مسئول ہو، خود اس کا پرستار ہو، خود اس کے

پاس ہو' خود اس کا حاکم ہو' خود اس کا سرپرست ہو اور وہ خود اس کے اختیار میں ہو تو پھر کیا کہنے' وہ خود بھی اپنے اختیار میں ہو۔ روزانہ ساڑھے چھ بجے صبح (ڈیڑھ گھنٹے پہلے) اپنے گھر سے صاف' سیدھے' آزادی سے' بلا دغدغہ' بلا وسوسہ' باضابطہ طور پر گھر سے نکلے' ٹیکسی کا انتظار کرے' اس میں بیٹھے اور ٹیکسی کو کہے سیدھے چلو' فلاں میدان' فلاں خیابان' فلاں گلی اور فلاں جگہ سیدھے ہاتھ..... کتاب خانے کے سامنے' اور نظام عمل بھی واضح طور پر اس کے ساتھ ہو۔ ٹیکسی سے اتر کر سیدھا کتب خانے جائے' گھنٹی بجائے' اندر داخل ہو' بغیر کسی تامل کے اپنے مطالعہ کے کمرے میں پہنچے اور سیدھے اپنی کتابوں کی طرف جائے' انہیں اٹھائے' اپنے سامنے رکھے' سگریٹ سلگائے' چائے پیئے اور پھر کتابیں کھول کر پڑھنے' لکھنے' اور سوچنے میں مصروف ہو جائے..... دن کے ایک بجے تک اور پھر خدا حافظی کر کے باہر نکل جائے اور پونے دو بجے پھر لوٹ آئے اور رات گیارہ بجے تک' ہو سکتا ہے ۱۲ بجے تک' شاید ساڑھے بارہ' شاید ڈیڑھ' شاید پونے اور شاید..... غروب ماہ تک..... ہر وقت' ہر..... سارے وقت' مسلسل..... اس سرچشمے میں غوطہ ور رہے جس کے نشے میں وہ ہمیشہ چور رہتا ہے--- اور جو غاصب خلافت کے ہاتھ میں ہے---

سعید نفیسی نے ایک ایسا مقام حاصل کیا کہ وہ خود کتاب خانے کا متولی ہوگیا۔ لیکن ان باتوں کو کوئی کیا جانے؟ کوئی کیا سمجھے؟ کوئی یہ بات سوچ بھی نہیں سکتا کہ مسجد کا امام مسجد کا متولی بھی ہوجائے؟ کسی کو کیا معلوم کہ مسجد کا حال کیا ہوگا؟ سعید نفیسی نے ایک عمر کتاب خانے میں گزاری۔ وہ عینک تلے آہستہ آہستہ چور نگاہوں سے کتاب کو تکتا رہتا تھا۔ اس کا دل حسرت، ولولے، اور درد سے تپتا رہتا تھا۔ وہ آہستہ، تہذیب اور احتیاط کے ساتھ میز کے ایک کونے میں بیٹھ جاتا تھا، اس کی مطلوبہ کتاب اس کے ہاتھ میں ہوتی تھی اور وہ اس معترفانہ انداز کے ساتھ کہ یہ کتاب اس کی نہیں ہے، قومی پارلیمانی کتب خانے کی ہے، پارلیمانی ارکان کی ہے، آقای حبیبی، آمیرزا، اور "بادمجون" کی ہے، سعید نفیسی کی نہیں ہے! کتاب کا مطالعہ کرتا تھا۔ گھنٹوں سوچ میں گم رہتا تھا۔ اس کا طائر خیال ہمیشہ عالم سیر میں ہوتا تھا اور اس سے اس کا دل، اس کی روح، اور اس کی فکر کو سرور ملتا تھا اور وہ بھری پری رہتی تھی۔ اس کے خیال کو توانائی ملتی تھی اور وہ اس کے ساتھ خلوتوں میں گم رہتا تھا۔ عالم استغراق میں چلا جاتا تھا۔ اس پر نشہ طاری ہوجاتا تھا، اس کے سارے وجود میں حرارت پیدا ہوجاتی تھی، گرمائش آجاتی تھی اور وہ کتاب کو ہاتھ سے رکھ دیتا تھا

اور پھر اسے کتب خانے کے اسٹور میں واپس رکھ کر اکیلا گھر لوٹتا تھا اور کتاب کی حسرت میں پگھلتا رہتا تھا۔ اس کی یاد اسے سونے نہیں دیتی تھی۔ وہ بڑی مشکل سے' بڑے کرب کے ساتھ سوتا تھا' اور صبح جب سو کر اٹھتا تھا تو پھر یہی صورت سامنے آتی تھی۔

مگر اب وہ خود کتاب خانے کا متولی ہے۔ کتاب اس کے اپنے ہاتھ اور اپنے اختیار میں ہے۔ تولیت' امام کو دے دی گئی ہے! کتاب خواں' کتاب شناس' اور کتاب پرست' کتاب دار ہوگیا ہے!! لائبریری کا انچارج ہوگیا ہے۔ لائبریری کے انچارج کی گفتگو بھی ایک فالتو بات ہے!

اچانک پورے شہر میں شور بپا ہوا' ہائے وائے مچ گئی' چیخ و پکار ہونے لگی' شکایت' مقدمہ' ارے بے شرم' ارے دھوکہ باز' ارے فریبی' ارے فلاں' یہ ہیں استاد' یہ ہیں دانشمند! اور یہ ہیں محقق کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ لوگ کہہ رہے تھے : اس قدر کہا جارہا تھا کہ استاد سعید نفیسی ایک مرد علم' مرد فکر' مرد فہم' اور دور اندیش انسان ہیں۔ ان کی روشن خیالی' پاکدامنی' شرافت' اخلاق' عظمت روح' حساسیت قلب' فہم و فراست' فطانت' بزرگی' ہوشیاری' خوبی اور نیک نامی کے چرچے تھے..... اور یہ سب بولنے کی باتیں تھیں'

سب جھوٹ تھا..... دیکھا اس نے کیا کیا؟

کیا کیا؟ آپ کے خیال میں اسے کیا کرنا چاہئے تھا؟ اس نے ایک انتہائی خوبصورت، نفیس، نایاب، قیمتی اور غیر معمولی نسخے کو جس کی ساری دنیا میں نظیر نہیں تھی، جس کی جلد زرکوب اور اعلیٰ درجہ کی تذھیب کاری اور نقش و نگار سے مزین تھی، جس کا کاغذ ایک خوش خرام خوبصورت جوان سال ہرنی کے بچے کی جھلی سے تیار ہوا تھا، جس کا خط ہماری تاریخ کے سب سے بڑے خطاط مرزا علی رضا عباسی کی تحریر تھی، جس کی نقاشی، مینا توری، رنگ آمیزی، خط کشی، ظرافت خطوط اور معجز نما دقیق مغلق اور پر تکلف کام غیر معمولی نوعیت کا تھا۔ خاص طور پر اس کے مطالب بڑے عجیب، تازہ، نفیس، خوبصورت اور قابل قدر تھے۔ جس کا متن بڑا منطقی، فکری، احساس کو بیدار کرنے والا، اور انتہائی ادبی تھا، جو خوبصورت افکار، دلکش زبان، شاعرانہ احساس اور ظریف خیالات کا مرقع تھا..... بلکہ ہم اسے ایک آیت اور ایک حکایت بھی کہہ سکتے ہیں، جو قومی پارلیمنٹ کے کتب خانے کی ملکیت تھا اور جسے مذکورہ کتب خانے میں وقف کیا گیا تھا اور جس کا وقف نامہ اب بھی موجود ہے جس پر مشہور و معتبر لوگوں کے دستخط اور مہر ثبت ہیں اور جسے ہمیشہ کے لئے وقف کیا گیا ہے : عین القضات

ہمدانی (نہیں ہمدانی نہیں، کوئی اور ہے، اس وقت مجھے یاد نہیں) کی عارفانہ غزلیات اور عاشقانہ رباعیات پر مبنی اس دیوان کو ۱۳۸۷ ہجری میں (تقریباً" تین سو سال پہلے) قومی پارلیمنٹ کے مبارک کتب خانے میں.....

جی ایک ایسے نسخے کو جو قومی کتب خانے میں ہمیشہ کے لئے وقف تھا، اور جس کی مالکیت کا حق درحقیقت پارلیمنٹ کے ممبر کو حاصل ہے، اسے اس پاکدامن محقق اور نیک نام دانشمند جناب استاد نے کہ جس نے ایک عمر، علم و قلم و آزاد منشی میں گزاری ہے اور جس کے سر کی لوگ قسم کھاتے تھے، چرایا ہے! جی ہاں، چوری کی ہے!

مقدمہ قائم ہوا، قاضی کو دیکھئے، اس کی بلند نگاہی کو ملاحظہ فرمایئے! اس نے اپنی رائے پیش کی اور کہا : جی، جرم وقوع پذیر ہوا ہے (کیونکہ اس کا انکار نہیں ہوسکتا تھا، اس لئے کہ کتاب کو استاد کے ہاتھ میں دیکھا گیا تھا اور خود استاد نے بھی اس کا اعتراف کیا تھا) لیکن بہ ایں سبب کہ استاد نفیسی دل و جان سے کتاب کے شیدائی ہیں اور اس سے والہانہ عشق کرتے ہیں، جونہی انہوں نے اس کتاب کو دیکھا، اسے پڑھا، اس کی اہمیت کو سمجھا، اور اس کی ظرافت، اس کی تذہیب و تجلید، اس کا خط، اس کی نقاشی، اس کی شیرازہ بندی اور مینا

توری نیز اس کے اشعار کی لطافت' احساس کی رقت' اور متن کی نفاست ان کے زیر نظر آئی اور انہوں نے اسے بے بدل دیکھا' ان سے رہا نہیں گیا اور وہ اس طرح بے خود و بے تاب ہوئے کہ انہوں نے اپنے آپ کو' کتاب کے وقف نامہ کو' قومی پارلیمنٹ کی لائبریری کی مالکیت اور سبھی کچھ کو بھلا دیا' اور اس غرض وغایت کو بیچ میں لائے بغیر کہ وہ خصوصی یا حکومتی اموال کے غصب اور سرقت کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ اس اپنی نظیر آپ کتاب کو اپنے ساتھ گھر لے گئے تاکہ وہ ان کے مطالعہ کے کمرے میں ان کے ساتھ ہو اور ان کے اس وصال کو فرقت نہ ہو' اس لئے کہ اس سے مفارقت ان کے لئے قابل تصور نہیں تھی۔ گو کہ یہ فعل بظاہر تعزیراتی جرم میں آتا ہے لیکن چونکہ مجرم کی نیت کسی جرم کا ارتکاب نہیں تھا اور اس نے اس کام کو عام حالت سے ہٹ کر انجام دیا تھا اور اس میں اس کی خاص مزاجی کیفیت کا دخل تھا اس لئے عدالت اسے بری کرتی ہے۔"

استاد نفیسی تو چھوٹ گئے' مگر صرف عدالت میں' عوام تو اس بات کو نہیں سمجھتی' اس رائے کا سب نے مذاق اڑایا' یہاں تک کہ اہل فضل اور معتبر لوگوں نے بھی اسے مضحکہ خیز قرار دیا۔ یہ لوگ سعید نفیسی کے فعل اور ان نادر کتابوں کو بیچنے والے لوگوں کے فعل

میں فرق کو نہیں سمجھتے کہ جو کتب خانوں کی دیواریں پھاند کر آتے ہیں اور چپکے سے کوئی نسخہ اڑا جاتے ہیں! ہائے کہ نا سمجھی بھی کتنی بری شے ہے۔ نفیسی کو کتاب چور کہا۔ وہ اس وقت کے احساس کو کہ جب اس سے وہ کتاب واپس نہ رکھی گئی اور یہ نہ ہوسکا کہ وہ وقف نامہ پر عمل کرے اور خود تنہا باہر آئے اور تہران کی فضول سڑکوں پر ڈولتا پھرے اور اپنے آپ کو کہ جس نے ایسے عالیشان نسخہ غزل کو دیکھا' پڑھا اور سمجھا ہے' اس "سیاست نامہ" کی کتاب سے مصروف کرے کہ جس کے لاکھوں یکساں نوعیت کے تکراری نسخے ہر دکان پر بکھرے پڑے ہیں۔ اس چور کے احساس کے ہم پلہ سمجھ رہے ہیں کہ جو نایاب نسخوں کو اس طرح چوری کرتا ہے جس طرح تانبے کا لوٹا چراتا ہے!!

نفیسی جیسے شخص کے لئے کتاب اس کا توتم ہے۔ کتاب' کتاب کو سمجھنے والے' کتاب کو پڑھنے والے اور کتاب کی تعظیم و تکریم کرنے والے کا توتم ہے۔

یقیناً" ہم سب توتم پرست ہیں' ہر کسی کا ایک توتم ہے' ایک ایسا توتم کہ جس میں اس کے جداعلیٰ کی روح' اس کے قبیلے کی آتما' اس کی فطرت کے پہلے ریشے اور اس کی خلقت کے اصلی عنصر نے

حلول کر رکھا ہے۔ اس کا توتم' وہی اس کا "پہلا جوہر حقیقی" اور وہی "آپ خود" ہے کہ جو اس شکل میں اس کے وجود کے اندر متجسم ہوا ہے اور جس نے عینی مادی شکل اختیار کی ہے۔ یہ اس کی وہ روح ہے جو جسم کی صورت میں نمودار ہوئی ہے' وہ شخصیت ہے جو شے بن کر ابھری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ توتم پرست' اپنے توتم کی پرستش میں اپنے اندر مدفون ذات اور اپنے اندر طاقتور نفس کو پوجتا ہے۔ ہمارے قابو سے باہر ذات میں سارے بلند پایہ اقدار' منتہای آرزو کی ساری خوبصورتیاں' سارے ناقابل انکشاف اسرار' سارے بیان سے باہر مفاھیم' سارے ماورائی موجودات' ساری خدائی خُلق و خُو' اور وہ تمام نامرئی' غیر محسوس' اور آھورائی ماورائے عقلی تمسکات' تعلقات' جذبات اور رجحانات' وہ عناصر ہیں جو فطرت کے نہفتہ ترین اعماق سے' صحرائے ابدیت روح کے دور افتادہ ترین افق سے اور انسانوں کی "ٹر" کے پس پردہ سے کبھی ہمارے باخبر ضمیر کی دیوار پر اپنا سایہ ڈالتے ہیں اور کبھی ہمارے جی کے زیر تسلط صحراؤں اور بلند و بالا پہاڑوں پر ایک معجزہ کی طرح ہوتے ہیں' مگر پھر اس ظالم جاہلیت کی ظلمت میں کہ جو ہماری زندگی پر سایہ فگن ہے اور لحد کے اس بھاری پتھر کے نیچے کہ جو ہماری جامد زندگی کے سینے پر دھرا ہے ہمیشہ کے لئے

دفن ہوجاتے ہیں' اور ابدی سکوت اور موت کی خاموشی انہیں معدوم کردیتی ہے۔ لیکن توتم--- یہ جادو اثر رشتہ' یہ ہمذات و ہمزاد' یہ یگانہ کہ جو تھا اور اب نہیں ہے' یہ میری اچھی اور سچی ذات کہ جسے ہونا چاہئے تھا اور نہیں تھی اس "کاش کہ" کی یادگار کہ جو اب "حیف" اور "افسوس" بن گئی تھی--- ان سب کی جلوہ گاہ و جلوہ گر ہے' "مجھ شہید" کا گھرانہ ہے' بھائی' بہن ہے۔ میری مظلوم زندگی کی قربانی کا بچا ہوا جز ہے' اس خاندان کا بچا ہوا طفل ہے جس نے خلافت میں کسی کو نہیں چھوڑا اور تاریخ نے اسے خاک میں ملادیا' اور "کرون" نے--- اس بیرحم دیوتا نے کہ جو صرف گھریلو مرغیاں' "بال و پردار" مرغ اور انڈے یا گوشت کے استعمال میں آنے والے وہ کھوٹے پالتو پرندے پالتا ہے جو اڑ نہیں سکتے اور انہیں اڑنا بھی نہیں چاہئے--- ان موہوم پرندوں کو کہ جو عدم میں پرواز کرتے ہیں طوفان کے حوالے کیا' انہیں زندگی کے سڑے کیچڑ میں لا پھینکا اور ان عقابوں کو کہ جو سحر کی ٹھنڈی ہوا میں سانس لے رہے تھے اور سفیدہ صبح کی نازک شاخ کو افق کے سینے سے چن رہے تھے اور جو ملکوتِ عشق میں پر سے پر ملائے ابدیت کی اڑان میں خدا کے قرب تک پہنچنے کی کوشش میں تھے' نیچے کھینچ لیا اور ہر ایک کو' ایک بھدے سیاہ غلیظ

کوے کے پہلو میں روز مرگی، عقل، حساب و کتاب، مصلحت، عرف و عادت، نصیحت اور نظم و نظام و سنت جیسے دسترخوان پر لا بٹھایا..... اور بس! شاید اس لئے کہ دیوار دل پر سایہ حسرت پڑا رہے، خلوت درد میں کوئی سرد آہ یا گرم آنسو باقی رہے اور ذہن کو سوچ کی راہ ملے..... اور بس! لیکن..... آخر کیوں..... اس امر میں ہماری کوئی یادو یادگار، کوئی قرابت دار، کوئی نائب نہیں جس میں ہمیں ہونا چاہئے تھا اور..... نہ ہوئے، اس شہید کا کوئی شاہد نہیں کہ جسے رہنا چاہئے تھا اور نہ رہا، جنگ لڑی کہ فتح کرے اور نہ کیا، خاک پر گر پڑا اور آرام گاہ مرگ اور جرائم کے قتل گاہ کی گود میں دفن ہو گیا! تو تم!

اور ہر کسی کا ایک تو تم ہے جو اس کا قرابت دار ہے، اس کی قرابت داری کی یادگار ہے، جو عالم ذر کی تجلی گاہ، قالو! : بلیٰ کا صبح الست، اس کی چاہت کی نشانی، اس کے وطن کا یاد آور، اس کے محراب نماز کی سجدہ گاہ اس کے باتوں کی بستہ لب خاموش زبان "وہ باتیں جو نہ کہنے کے لئے ہیں" اور آخر کار وہ پتھر کا ٹکڑا، وہ شاخ، وہ برگ، وہ پھول وہ مشت خاک ہے جسے وہ ہبوط کے بعد جنت سے اپنے ساتھ لایا اور جو اس کی ہولناک غربت، سیاہ انیت، سنگستان قفقاز کے بے جان اور انجان چوٹیوں پر، جلاوطنی کی رقت بار تنہائی اور جگر

خوار گدھوں کی ہمسائیگی میں اس کے پاس ہے اور وہ ان سے جنت کی بو سونگھ کر بنجر زمین کا دکھ بھلا رہا ہے اور نمرودی دوزخ کی آگ کو ابراہیمی سرخ پھولوں کی سیج پا رہا ہے اور بالا خر اس کے ساتھ وہشت کے سرد گورستان میں زندگی گزار رہا ہے' اور وہ اس کا توتم ہے۔

ہر ایک کا ایک توتم ہے اور توتم "ذکر" ہے۔ کیا زندگی فراموشی کے سوا اور کچھ ہے؟ کیا خوش نصیبی' لذت کے سوا کچھ اور ہے؟ کیا آسودگی ہر چیز کے بھلانے کا نام ہے؟ اور "آدمیت" کو لیجئے تو وہ بہشت کا کھونا ہے' ھبوط ہے' جلاوطنی ہے' کوہستانی بنجر زمین ہے' غربت ہے' تنہائی ہے' مرغ و مورو مگس کے ساتھ ہم خانگی اور ہم نشینی ہے! خوش قسمت وہ بدنصیب ہے کہ جس نے اپنے آدمی ہونے کو سرے سے بھلا دیا ہے' لیکن بدقسمت--- جسے ابھی تک اپنی سرگزشت یاد ہے--- وہ خوش نصیب ہے کہ جو "جمود میں باقی رہنے" کے دکھ کو پہلے کی طرح محسوس کر سکتا ہے' اس لئے کہ وہ اب بھی آدمی ہے۔ اور ہر کوئی "آدمی" ہے :

اگر ابھی تک اس میں فراموشی نہ آئی ہو تو!

"توتم" تمہیں فراموشی کا شکار نہیں ہونے دے گا' ہر دم تمہیں یاد دلاتا رہے گا۔ توتم--- بہشت' آدم' حوا' خدا' شیطان' عشق'

عصیان آگہی' اور ایک بنجر علاقے میں ہبوط کا "مجسم ذکر" ہے!

ہر کسی کا ایک توتم ہے اور وہ خود اس کی "اچھی ذات" ہے۔

"توتم" ایک ماورائی ذات کا حامل ہے' ایک غیبی موجود ہے' وہ طبیعت کی جنس سے نہیں' اوز ارکار نہیں' منفعت حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں' نام بخشنے والا نہیں' نان پز نہیں۔ ہم کہاں سے سمجھیں کہ توتم ایک مادی شے نہیں' غیبی رمز ہے؟ خاکی نہیں خدائی ہے؟

بہت واضح ہے' اس دنیا میں ہر چیز میرے لئے ہے' لیکن---

توتم؟ میں اس کے لئے ہوں۔ میری تمام ضرورتیں' اس کی ضرورتوں کو پورا کرنے سے سیراب ہوتی ہیں۔ میرا سارا وجود' اس کے آستانہ' محبت میں مرنے اور قربان ہونے سے ابھرتا ہے۔ جب میں اس کی خاطر اپنے پیر سے چل کر "اپنی قتل گاہ" میں آتا ہوں تو شہادت میرے حیات کی گواہی دیتی ہے اور جب میرا غرور اس کی بلند چوٹی پر ٹوٹ کر اس کے قدموں میں گرتا رہے' تو مجھے سیری حاصل ہوتی ہے' اور میں اپنے خضوع پر مباہات کرتا ہوں۔ اپنی جمود بھری زندگی کو دوسرے کی نذر کرنا' دوسرے کے جبر کو دل سے اختیار کرنا۔ اس کی یاد میں اپنے آپ کو مسحور کن لذت اور ناقابل وصف جذبہ خیزی کی حلاوت کے عالم میں بھول جانا' اور بالاخر اس کے بھبھڑوں سے سانس لینا' اس

کی نبض سے دھڑکنا' اس کے قدموں سے چلنا' اس کے حلقوم سے آہ و زاری کرنا' اس کے ساتھ جینا' اس کے ساتھ مرنا' جان دینا' اور پھر منتہائے آرزو کو پہنچنا' یہ سب وہ میلانات' وہ خواہشات' وہ رجحانات اور وہ اتصالی رشتے ہیں جو اس دنیا کی عقل میں نہیں سماتے' ڈکارٹ کی منطق اسے نہیں سمجھتی۔ اغیار کا علم و فلسفہ اس سے اتنی دور ہے کہ یہاں راہ نہیں پاتے۔ اس سراپردہ غیبی (غیبی بارگاہ) میں رخصت نہیں ملتی۔ یہ ان بلند بارگاہ دلوں کی جگہ ہے کہ جو "چاہت" کو--- کہ جو ایک غیبی راز ہے--- پہچانتے ہیں اور ان مہربان شخصیتوں کا دامن ہے کہ جو اس ویرانے میں اب بھی "آدم" ہیں اور اب بھی "غربت" کو محسوس کرتے ہیں' اور "پرستش" کو اپنے اندر کی صفت پاتے ہیں۔ یہ لوگ اندھی کمائی' شکم پروری' لوٹ کھسوٹ' ذخیرہ اندوزی' چالاکی' مکاری' صنعت' قدرت' ثروت' اندھی پیشرفت' موقع شناسی' سلامت' عقل' مصلحت' حیثیت' شہرت' لذت' آرام و آسائش' اور سعادت و منفعت سے بالاتر ہیں۔

یہ لوگ عشق کے بے تاب کن' حیرت انگیز' ماورائی اور پوشیدہ مفہوم سے آشنا اور ارادت' چاہت' پرستش' شہادت' درد' دعا' ایثار' اشک و آہ' تنہائی' اخلاص' یکتائی' یک نفسی' اضطراب' انتظار' صبر'

حق' منزلت' قداست (طہارت)' ایمان' زیبائی اور خیر سے منسلک ہیں۔

یہ سب غیبی مفاھیم اور جنت کی یادگاریں ہیں کہ جو آدمؑ کے ساتھ زمین پر آئی ہیں' اور زمین پر نیز آدم کی طرح اجنبی' غریب' معماتی' مجہول اور سمجھ میں نہ آنے والی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب میں ان کے بارے میں سوچتا ہوں تو یہ متشدد' عقل کے پیروں تلے کچل جاتے ہیں اور اس کی رہگزر سے بھاگ نکلتے ہیں' اور پھولوں کی نازک پنکھڑیوں اور ناشگفتہ غنچوں کی طرح "پوسٹ مارٹم" کی انگلیوں تلے مضمحل ہوجاتے ہیں اور "علم کی خشک نگاہوں" کے صائقہ میں محو ہوجاتے ہیں اور جب کبھی ہم--- اور اس کے فضول اور متشدد استدلال کے بغیر کہ جو سوائے سود و صلاح اور کچھ نہیں جانتی--- اپنے آپ کو اپنے پاک و صاف ذات کے حوالے کرتے ہیں' اپنے نکھرے ہوئے پاکیزہ احساس پر تکیہ کرتے ہیں' اپنے سچے ضمیر پر کہ جو ہماری فطرت کی گہرائی سے ابھرتی ہے بھروسہ کرتے ہیں تو براہ راست اپنی ذات کی اس آواز کو سنتے ہیں جس میں نہ لفظ ہیں اور نہ صدا اور یہ آواز ہمیں صاف اور سہل انداز میں سنائی دیتی ہے' ہم اسے لمس کرتے ہیں حتیٰ کہ اس کا وزن بھی ہماری حس کی گرفت

میں آتا ہے، ہم اسے سنتے ہیں، سونگھتے ہیں، پاتے ہیں.....

ہر کسی کا ایک توتم ہے، "ہر اس کا کہ جس نے بھول کو گلے نہیں لگایا ہے" ہر اس کا جو ابھی آدم ہے، جو ابھی غربت کو محسوس کرتا ہے، جس نے اس اجاڑ بستی میں، جن، بھوت، ارواح خبیثہ، خوفناک سائے، سانپ، بچھو، "بھیڑیئے" "لومڑی" "چوہے" اور "مینڈھے" کی صورت اختیار نہیں کی ہے، جو ابھی "گینڈا" نہیں بنا ہے، ابھی مسخ نہیں ہوا ہے، ابھی شب نہیں ہوا ہے، شب کی خو نہیں پکڑی ہے، جو پہلے کی طرح خائف ہے، مضطرب ہے، اجنبی ہے، جو صبح کی بات کرتا ہے اور طلوع و نور و آفتاب کے بارے میں سوچتا ہے، جو لق و دق صحرا کے اندھیرے میں مشرق کے روبرو افق کی بستہ پلکوں پر اپنی پلکیں جمائے کل کے انتظار میں تنہا کھڑا ہے۔

جو ابھی تک آدم ہے، ھبوط کو دردمندی سے محسوس کرتا ہے۔ اسے ابھی شفا نہیں ہوئی ہے۔ وہ ابھی مجروح ہے۔ ابھی اس نے بہشت کو، صحرا کو، عصیان کو، جلاوطنی کو، شیطان کو، حوا کو، نہیں بھلایا ہے..... اور ان تمام غیبی امانتوں کے ساتھ جسے وہ آدمیت کے ساتھ زمین پر لایا ہے وفادار ہے، اور سب کو یاد رکھا ہوا ہے، اس کا توتم، اس بہشت کو یاد دلانے والا ہے، وہ ان تمام غیبی توشوں اور

ماورائی ذوات کی جلوہ گاہ ہے جنہیں وہ اپنے ساتھ لایا ہے۔ اس کا توتم وہ طلسم ہے جو زمانے کے جادو کو توڑتا ہے' وہ حرز ہے جو زمین کی بلاؤں سے اسے محفوظ رکھتا ہے۔ وہ شمع ہے جو شب کی ظلمت میں اسے روشنی بخشتا ہے' اور وہ مخاطب ہے کہ جو اس صحرا کے خاموش قبرستان میں اس سے باتیں کرتا ہے' اس سے بولتا ہے اور اس کی سنتا ہے' "ان باتوں کو کہ جو اس کے پاس نہ کہنے کے لئے محفوظ ہیں!"

ہر کسی کا ایک توتم ہے کہ جس کی وہ قسم کھاتا ہے' قسم! قسم نیز ان ہی ماورائی مفاھیم سے ایک ہے۔ ان ہی بہشتی توشوں میں سے ہے کہ جنہیں ہم نہیں سمجھتے لیکن محسوس کرتے ہیں۔

ہر کسی کا ایک توتم ہے جس سے وہ عشق کرتا ہے' محبت کرتا ہے جسے وہ چاہتا ہے' پوجتا ہے' جس کے لئے وہ آنسو بہاتا ہے' دعا کرتا ہے' فریاد کرتا ہے' آنسو بہاتا ہے' صبر کرتا ہے' اخلاص برتتا ہے' منزلت کا قائل ہوتا ہے' تکلیف جھیلتا ہے' دکھ اٹھاتا ہے اور ایثار سے کام لیتا ہے۔ اس کے لئے وہ ان خوبصورتیوں کا قائل ہوتا ہے کہ جو فطرت میں نہیں۔ ان نیکیوں کو مانتا ہے جو فہم منطق میں نہیں' اس قداست یا پاکیزگی کو تسلیم کرتا ہے جو اس دنیا کی جنس نہیں اور پھر وہ اس سے الہام لیتا ہے' سیکھتا ہے' اپنی ذات میں اتارتا ہے' حلول کو

عمل میں لاتا ہے۔ اپنے آرزو مند تشنہ ضمیر کو اس سے سیراب کرتا ہے۔ اس کا اس پر ایمان ہوتا ہے۔ وہ اس پر نماز پڑھتا ہے' اپنے نہ ٹوٹنے والے فولادی غرور کو--- جو کسی صاحب اقتدار کے آگے نہیں جھکا ہے--- مغرورانہ انداز میں اس کی قامت والا پر توڑ دیتا ہے' اور روٹی' مقام' جان' حتیٰ کہ اپنے نام کو بھی اس کی بارگاہ خاطر میں بے تابی کے تیغ سے اسماعیل صفت قربان کرتا ہے اور پھر طواف "یکجائی" نماز "یکتائی" اور سعی "بے توئی" کے بعد "شور شناخت" اور "شعور فہم" سے ہٹ کر اس کی سمت ہجرت اختیار کرتا ہے اور اپنے حج کی آخری منزل پر پہنچ کر اس کے "منیٰ" ی عشق میں اپنے "خون کا جشن" مناتا ہے' اس کے قدموں پر "شہادت" کے بلند بام تک صعود کرتا ہے' اور سرخ خون کی معراج پر پہنچتا ہے' "ایثار" کے سدرۃ المنتہی کو پار کر جاتا ہے' دوسرے کی حیات کے لئے اپنے خون میں غوطہ زن ہوتا ہے اور اپنی قتل گاہ کے گڑھے میں اپنا سر ڈال دیتا ہے اور اس کے دائیں بائیں' اخلاص و ایثار سے متعلق دو شہپر شوق ابھر آتے ہیں جس سے وہ خدا کی سمت پرواز کرتا ہے۔

ہر کسی کا ایک توتم ہے اور وہ اس کے بہشتی "من" کا قرابت دار ہے' اس "من" کا پسماندہ جو "زندگی" میں "شہادت" پر فائز ہوا ہے۔

جو "روز مرگی" کے پلید و حریص و غلاظت خور کووں کے شور و غل میں خاموش ہوگیا ہے' جو زمین کی گھناؤنی دکھاوٹ اور زمانے کی پر فریب آتش بازی میں فراموش ہوگیا ہے۔

ہر کسی کا ایک توتم ہے جو اسے یہ یاد دلاتا ہے کہ کبھی وہ بھی آدمی تھا اور اس کی نشانی یہ ہے کہ وہ اب بھی پوجا کر سکتا ہے' اب بھی دوسرے کے لئے جی سکتا ہے۔ اب بھی عشق سے ہم آغوش ہو سکتا ہے۔ وہ سود و صلاح و واقعیت سے آگے بڑھ گیا ہے اور قدر و منزلت و حقیقت و ارمان کے مفہوم کو سمجھ سکتا ہے' یہاں تک کہ اوج ایثار تک پہنچ سکتا ہے۔

بہرحال' ہر کسی کا ایک توتم ہے اور میرا توتم قلم ہے۔

ہر قبیلے کا ایک توتم ہے کہ جس میں اس پورے قبیلے کے جد اعلیٰ کی روح سمائی ہوئی ہے اور اسی میں وہ قبیلہ زندہ جاوید ہے' قبیلہ کی روح نے اس میں جسامت اختیار کی ہے' اس کا مارنا' اس کا کھانا' افراد قبیلہ پر حرام ہے' دوسرے قبیلوں پر نہیں' وہ سب اجنبی ہیں۔ ان کے سب کے الگ توتم ہیں۔ وہ سب کسی اور توتم کے خاک و خون اور نسل و قبیلے سے ہیں۔ ہر توتم کو مارنا' کھانا' اس کی کھال اتارنا' دودھ دوھنا' اون اتارنا اور مبادلہ و فروخت اس کے قبیلے کے افراد پر

حرام ہے۔ توتم' خدائے قبیلہ ہے' رب النوع قبیلہ ہے (نمائندہ خدا ہے)' ناموس قبیلہ ہے۔ سارے قبیلہ کی مشترک ماورائی ماہیت ہے' مشترک انسانی جوہر ہے' روح و شرف و قداست و حقیقت و شخصیت و تجلیِ ذات اور نسل و خاندان و وحدت و اصالت اس میں بصورت جسم نمایاں ہے۔

اور قلم میرے قبیلہ کا توتم ہے' سارے قبائل کا خدا۔ سارے عالَموں کے خدا اس کی قسم کھاتے ہیں۔ اس سے جو کچھ پھوٹتا ہے اس کی قسم کھاتے ہیں۔ اس کی گردن سے ٹپکنے والے سیاہ خون کی قسم کھاتے ہیں--- اور میں؟

قلم' میرے سچے "میں" کا قرابت دار ہے۔ میرے روح القدس کا عطیہ ہے۔ میرے خاکستری اور سبز دفتروں کی زبان ہے' میری خلقت کا ہمزاد ہے' میری ہجرت کی زاد راہ ہے۔ یہ میرے ھبوط کا ساتھی ہے' میری غربت کا انیس ہے' میری جلاوطنی کا رفیق ہے' میری چوتھی نوع کا مخاطب ہے' میری خلوت و عزلت و تنہائی کا ہمدم ہے' میری سرگزشت' میری سرشت' اور میری سرنوشت کا یاد دلانے والا ہے۔ میری وہ روح ہے کہ جس نے جسم اختیار کرلی ہے۔ "میری آدمیت" ہے جو شے بن گئی ہے۔

وہ "امانت" ہے جو مجھے سونپی گئی ہے۔

آہ، کتنا سخت اور وزنی ہے! زمین اس وزنی بوجھ کو اٹھانے سے انکاری ہے، پہاڑی اس کے سامنے گھٹنے ٹیکتے ہیں، آسمان پھٹ کر زمین پر گر پڑتے ہیں۔

قلم میرے قبیلہ کا توتم ہے، ہماری روح اس میں گھل مل گئی ہے۔ ہم اس کے ساتھ ایک ہوگئے ہیں، ایک ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں اور ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہیں۔ جب کہ اور چیزیں ایسی نہیں ہیں۔ زندگی--- پرخچے اڑاتی ہے، زمانہ--- جدائی ڈلتا ہے، خودپرستی--- بیگانگی لاتی ہے، خوف--- ہر کسی کو خود سے بھگاتی ہے، اور عقل--- کہ جو تعلقات کو توڑتی ہے، اور انتہا کردیتی ہے---

... قلم میرا توتم ہے، وہ مجھے بھولنے نہیں دیتا کہ میں اپنے آپ کو بھلادوں اور شب کی خو پکڑوں، آفتاب کی نہ کہوں، گزرے ہوئے کل کو فراموش کروں، آنے والے شب کی نہ سوچوں، "انتظار" سے آنکھیں میچ لوں، ہتھیار ڈال دوں، ناامید ہوجاؤں، دن پھیرنے میں لگ جاؤں غیروں کی بندگی اختیار کروں، ہاں.....!

قلم میرا توتم ہے، وہ روزمرہ کے پرہجوم قیل و قال، بیہودہ شور شرابے، خوامخواہ کی کشمکشوں، زندگی کی پلیدیوں، زمین کی پستیوں،

زمانے کی بے رحمیوں، خاک کی ناہمواریوں اور حقارت وجود میں، شب و روز، بڑے زور و شور سے، بڑے ملتہبانہ انداز میں اور بڑے سخت لہجے میں ان خدائی کلمات کو میرے خون میں، میرے قلم میں، میری روح میں، میرے خیال میں، میرے دل میں، میرے ضمیر میں اور میرے حلق میں اتارتا ہے کہ میں انہیں نہ بھولوں :

خدائی شان، بہشت، آدم، تنہائی، حوا، شیطان، عشق، عصیان، بصیرت، ھبوط، صحرا، غربت، رنج و الم، "امانت"، رسالت، انتظار، اُنس، اسارت، جبر، خود آگاہی، قیام، تشیع، خلافت، ولایت، ایمان، مصلحت، حقیقت، سنت، آیت، تقیہ، تقلید، جہاد، اجتہاد، شہادت، ایثار، لوگ، طواف، ہجرت، غیب، احرام، حج، عرفات، مشعر، منیٰ، ذبح، معبد.....

قلم میرا توتم ہے۔ قلم کی قسم، اس سیاہ خون کی قسم جو اس کی گردن سے ٹپکتی ہے، اس خون کے قطرے کی قسم جو اس کی زبان سے مترشح ہوتی ہے، اس درد بھرے نالہ و فریاد کی قسم جو اس کے سینے سے ابھرتی ہے..... کہ میں اپنے توتم کو نہیں بیچوں گا، نہیں ماروں گا، اس کا گوشت نہیں کھاؤں گا، اس کا خون نہیں پیوں گا، کسی زور آور کے حوالے نہیں کروں گا، کیسہ زر کے سپرد نہیں کروں گا، مکر و فریب

بھرے ہاتھوں کو نہیں سونپوں گا' اپنے ہاتھ قلم کردوں گا مگر قلم کو ہاتھ سے نہیں رکھوں گا' اپنی آنکھیں پھوڑ دوں گا' کانوں کو سماعت سے محروم کرلوں گا' اپنے پیر توڑ لوں گا' اپنے ہاتھ کی انگلیوں کو پور' پور کاٹ لوں گا' اپنا سینہ شگافتہ کرلوں گا۔ اپنے قلب پر خنجر چلالوں گا' حتیٰ کہ اپنی زبان قطع کرلوں گا' لب سی لوں گا.....

لیکن--- اپنا قلم غیر کو نہیں دوں گا۔ اس کے جان کی قسم کہ میں اپنی جان اس پر نچھاور کردوں گا' اپنے اسماعیل کو اس پر قربان کردوں گا۔ اس کے خون سیاہ کی قسم کہ میں اس کے فرمان سے اپنے خون سرخ کی غدیر میں غوطہ زن ہوں گا۔ وہ جہاں بھی مجھے بلائے گا' جہاں بھی جانے کو کہے گا اور جو کچھ بھی مجھ سے چاہے گا میں اس کی اطاعت میں دیر نہیں کروں گا۔

قلم میرا توتم ہے' میری روح القدس کی امانت ہے۔ میرے پاک مریم کی ودیعت ہے میرا مقدس صلیب ہے' اس کی وفاداری میں قیصر کا اسیر نہیں بنوں گا' یہود کی زر خریدی میں نہیں آؤں گا' درندوں کی سامنے ہتھیار نہیں ڈالوں گا۔ اگر میرے سچے' استوار اور بلند قامت قلم پر سولی لگتی ہے تو لگنے دو' چار کیلوں سے میرے جسم کو ٹھونکا جاتا ہے تو ٹھوکنے دو' مجھے خوشی ہوگی کہ جو میرا استوانہ حیات تھا وہی میری

موت کا صلیب بن گیا' میرے پیغام کا گواہ بن گیا' میری شہادت کا شاہد بن گیا' اور خدا یہ دیکھ لے کہ میں نام کی خاطر قلم کی سولی پر نہیں چڑھا ہوں اور خلق یہ جان لے کہ میں کام دہن کے لئے اپنے توتم کے حرام گوشت والے دسترخوان پر نہیں بیٹھا ہوں' اور زور' زر اور تزویر کو یہ معلوم ہو کہ خدا کی امانت کو فرعونی لشکر مجھ سے نہیں چھین سکتا ہے' عشق کی ودیعت کو قارونی ٹولہ مجھ سے نہیں خرید سکتا' اور پیغام کی یادگار کو بلعمی جتھہ مجھ سے نہیں اچک سکتا.....

..... ہر کسی کا' ہر قبیلہ کا ایک توتم ہے۔ میرا توتم' میرے قبیلہ کا توتم قلم ہے۔

قلم خدا کی زبان ہے' آدم کی امانت ہے' عشق کی ودیعت ہے۔

ہر کسی کا ایک توتم ہے'

اور

میرا توتم قلم ہے

ہمارا توتم قلم ہے

ڈاکٹر علی شریعتی

شہرِ شہادت خدا حافظ

*

مترجم

سیّد محمّد موسیٰ رضوی

علی شریعتی کو سمجھئے

فرانس میں علی شریعتی کے قیام کا دور' ان ادوار سے متصل تھا جب ایرانی قوم ایک استثنائی تاریخ سے گزر رہی تھی' دوسرے لفظوں میں ان دنوں' ۲۸ مرداد ۱۳۳۲ شمسی کو رونما ہونے والے واقعات کے بعد خاص طور پر ۱۳۳۹ شمسی کے بعد سے ایران کی قومی تحریک کی سیاسی رو' زور پکڑ رہی تھی اور برسوں بعد کی خاموشی اور سکوت کے بعد مغرب میں ایرانی طلبہ نے جنبش اختیار کی تھی۔ ان کوششوں میں قومی تحریک اور اس کے عمر رسیدہ رہنماء کی نسبت علی شریعتی کے گہرے جذبات نیز اس کی محکم اور مستدل تحریروں اور انتہائی اہم تقریروں کی بنیاد پر اس کا شمار سچے مجاہدوں میں ہوتا ہے۔

یہاں ہم فرانس میں قیام کے دوران اس کی سرگرمیوں کے ایک گوشے پر سطحی نگاہ ڈالتے ہیں :

--- ۱۹۵۹ء میں اس نے الجزائر کی تنظیم آزادی میں بھرپور حصہ لیا اور بڑی سخت جدوجہد کی۔

--- ۱۹۶۰ء میں "ہم کس پر تکیہ کریں؟" کے عنوان سے اس نے ایک مقالہ لکھا جسے فرانس کے ایک مجلّہ نے بڑی آب و تاب سے چھاپا۔

--- ۱۹۶۱ء میں اس نے سارتر کی کتاب "شعر کیا ہے؟" کا ترجمہ کرکے اسے پیرس میں شائع کرایا۔

--- ۱۹۶۱ء کو الجزائر کی تنظیم آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کے جرم میں گرفتار ہوا اور پیرس جیل میں "باگیوز" کو ایک انٹرویو دیا جو ۱۹۶۵ء کو "توگو" میں شائع ہوا۔

--- ۱۹۶۲ء کو "فرانتس فانون کی موت" کے عنوان سے ایک مقالہ پیرس میں شائع کیا۔

۱۳۴۳ شمسی کو جب ڈاکٹر علی شریعتی تاریخ اور مذہبی سماجیات کی ڈگریاں لے کر ایران واپس لوٹے تو انہیں ترکی اور ایران کی سرحد پر گرفتار کرلیا گیا۔ ان کے بیوی بچوں کو دوسری گاڑی میں اور انہیں پولیس کی گاڑی میں تہران لایا گیا اور "قزل قلعہ" کے زندان میں مقید کردیا گیا۔

چند ماہ بعد وہ رہا ہوکر اپنی ولادت گاہ مشہد چلے آئے۔ ایک عرصے بیکار رہنے کے بعد "سوربن" کے فارغ التحصیل ماہرین سماجیات ڈاکٹر علی شریعتی کو مشہد کے تعلیمی محکمے نے وہاں کے ایک گاؤں کے مڈل اسکول میں چوتھی جماعت کا ٹیچر متعین کیا۔ بعد ازاں وہ شہر چلے

آئے اور وہاں مختلف اسکولوں میں تدریس کا عمل جاری رکھا۔ آخر کار انہیں مشہد یونیورسٹی میں تاریخ کے اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے ملازمت مل گئی۔

علی شریعتی کی کلاس تمام طلباء کے لئے اور ان لوگوں کے لئے بھی کہ جو صرف ڈگری لینے کے لئے یونیورسٹی آتے تھے بڑی اہم اور دل پذیر تھی، اس لئے کہ علی شریعتی الفاظ پر اپنی مکمل گرفت، وسیع معلومات اور عائد کردہ تمام پابندیوں کی رعایت کے ساتھ کوشش کرتے تھے کہ طلباء کو ان کی قومی ثقافتی اقدار سے روشناس کرائیں اور انہیں بے حسی اور بے اعتنائی کے خول سے باہر نکالیں تاکہ وہ اپنے کردار اور اپنی ذمہ داری سے واقف ہوں۔ بہت کم عرصے میں ڈاکٹر علی شریعتی نے اپنے دائرہ کار کو آگے بڑھایا اور اپنے مداحوں، مشتاقوں اور ارادتمندوں کی درخواستوں پر مختلف تعلیمی مراکز میں قدم رکھا اور آخر کار اپنی علمی اور دلکش تقریروں سے ایک عجیب فضا اور عجیب کیفیت پیدا کی اور حقیقت میں معاشرے کے فکری ڈھانچے کو نئے سرے سے قائم کیا۔

اسی دوران ۱۳۴۸ شمسی میں علی شریعتی "حسینیہ ارشاد" میں مدعو ہوئے اور کچھ عرصے بعد انہیں وہاں کے تعلیمی امور کی ذمہ داری

سونپی گئی۔ وہاں انہوں نے مذہبی سماجیات اور خاص طور پر شیعی تاریخ کی تدریس کا کام سنبھالا۔ ان کی کلاس میں ۵ ہزار طلبہ نے داخلہ لیا اور بلاناغہ شرکت کی۔ ان میں بہت سے طلبہ ایسے تھے کہ جو دور پرے کے چھوٹے شہروں حتیٰ کہ بندر عباس، شیراز اور زہدان جیسی جگہوں سے، صرف چند گھنٹوں کے درس سے استفاضہ کے لئے سفر کی زحمتیں جھیلتے تھے۔ شروع شروع میں ان کی کلاس مہینہ میں ایک دفعہ تشکیل پاتی تھی۔ مگر جلد ہی طلبہ کے اصرار پر اسے مہینہ میں دو دفعہ کردیا گیا اور ابھی تین چار ہفتے بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ ان کے شاگردوں کی حد سے زیادہ پیاس اور ضرورت نے کلاسوں کی تشکیل ہر ہفتہ کردی۔ تاریخ ادیان کی کلاسوں کا ایک مفصل نظام عمل تھا کہ جسے تین سال میں پورا ہونا تھا اور اس میں تاریخ و شناخت، مذہبی سماجیات، اور اسلام شناسی کے تین مراحل شامل تھے، جسے انتہائی اختصار اور سرعت عمل کے ساتھ ۲۰ فروردین ۱۳۵۰ شمسی کو شروع کیا گیا، لیکن بعض وجوہات کی بناء پر جس کی تفصیل اس مختصر تحریر کی گنجائش سے باہر ہے، اسے ادھورا چھوڑنا پڑا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے بہمن ۱۳۵۰ شمسی میں اسلام شناسی کی تعلیمات کا آغاز کیا اور مکتب کے بنیادی نظام پر روشنی ڈالی۔ لوگوں کا شوق اور ان کی پیاس بڑھتی گئی۔ "بات

اس معاشرے پر تھی کہ جس میں کچھ لوگ سوئے پڑے تھے اور کچھ پر بے حسی طاری تھی اور جو لوگ جاگ رہے تھے انہوں نے فرار کی راہ اختیار کرلی تھی۔ وہ چاہ رہے تھے کہ ان سوئے پڑے سحرزدہ لوگوں کو بھی بیدار کریں کہ وہ "اٹھ کھڑے ہوں" اور ان لوگوں کو بھی واپس لوٹائیں جنہوں نے کہ راہ فرار اختیار کرلی تھی تاکہ وہ "ٹک جائیں" اور یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔" اسی لئے انہوں نے ۱۳۵۱ شمسی کے موسم گرما میں رمضان کی ایک ایسی شب کو جس کی فضیلت ہزار ماہ سے برتر ہے "ہمیں کیا کرنا چاہئے؟" کا لائحہ عمل تیار کیا۔ وقتی طور پر پانچ تعلیمی شعبوں' اسلام شناسی' قرآن شناسی' تعلیمات برائے مبلغ' آرٹ' اور آخر میں عربی اور انگریزی زبان و ادب' نے کام کا آغاز کیا۔ علی شریعتی کے علاوہ کہ جس نے سب سے زیادہ اور سب سے اہم بوجھ اپنے کاندھے پر اٹھا رکھا تھا دوسرے افراد نے بھی اس میں حصہ لیا جس میں کہ ایک برجستہ شخصیت جناب مرتضٰی مطہری شہید کی بھی ہے۔ "حسینیہ" نے ان لوگوں کے لئے ایک بیس (Base) کی صورت اختیار کرلی تھی کہ جو کچھ کرنا اور کچھ سیکھنا چاہتے تھے۔ ڈاکٹر علی شریعتی نے واضح طور پر اپنے ان اقدامات کے ساتھ تشیع کے ان تمام شعبوں کو ابھارا کہ جو ناشناختہ تھے۔ وہ ایک لمحے کے لئے بھی

سوچنے سے باز نہیں رہتا تھا۔ اس کا ہر دوسرا لمحہ پہلے لمحے سے متکامل تر تھا۔ اس کے فکری سیر کے سلسلے کو آپ "حسین وارث آدم" سے لے کر "شہادت" اور پھر "پس از شہادت" تک بخوبی ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

"اس نے برسوں بغیر صلے کے زحمتیں جھیلیں اور اس دگرگوں شدہ قوم کی یادوں سے محو' ایمان کے "یادنامہ" کو پھر سے تازہ کیا۔ مگر آخر کار اس کی محنتوں پر پانی پھیر دیا گیا' اور جن لوگوں نے اس بات کو پسند نہیں کیا کہ مُردوں اور نابیناؤں کے بدن میں عیسیٰ کا حیات آفریں دم پھونکا جائے انہوں نے اسے بے گھر اور بے در کر دیا اور وہ افراد کہ جو لوگوں کے جہل سے..... علم کا کبادہ (جمناسٹک میں استعمال ہونے والی لوہے کی کمان) کھینچتے رہے اور دین کی مفقودیت سے دین کے دعویدار بن بیٹھے انہوں نے علوی تشیع کے قصور پر اس کی تکفیر کی اور عوام نے اسے اچھالا اور بے انتہاء تعصب سے کام لیا' کسی نے کہا : وہ رافضی ہے' کسی نے کہا معتزلی ہے۔ کسی نے کہا سنی اور اہلبیت کا مخالف ہے' کسی نے کہا بابی ہے' کسی نے کہا مزدکی ہے' کسی نے کہا میٹریالسٹ ہے' خدا اور قیامت کا منکر ہے۔ کسی نے کہا سعودی ملاؤں سے اس کی وابستگی ہے..... محمد کے نام پر " " اور علی کے

نام پر " * " کی علامت نہیں لگاتا اور ابھی حال ہی میں نیا انکشاف سننے میں آیا کہ آغا خانی ہے۔ اور..... بالاخر عالم نما لوگوں نے (جن کے بارے میں امام خمینی رحمتہ اللہ علیہ نے بلند آواز میں صاف صاف کہا کہ : "ہمیں چاہئے کہ ہم ہر کام سے پہلے ان عالم نما لوگوں کے خلاف اپنی ذمہ داری پوری کریں۔ جن کا شمار اسلام اور اہل اسلام کے خطرناک ترین دشمنوں میں ہوتا ہے اور جن کے ہاتھوں سے اسلام دشمن طاقتوں کے نقشے نافذ ہوتے ہیں۔") ان ہی عوام فریبوں نے کہ جو عوام کے جہل و تعصب و تقلید سے خوراک حاصل کرتے ہیں اس کی گفتگو کو سیاق و سباق سے ہٹا کر، تقریروں کے بعض حصوں کو حذف کرکے اور بعض دیگر حصوں میں نامناسب تعبیریں ٹھونس کر اس کی رد میں کاغذ کو سیاہ اور قلم کو بے حرمت کیا اور برسوں روحانیت کو ٹھیس پہنچانے والے ان ہی علماء نے اسلام اور روحانیت کے نام پر اس کی تحقیر کی، اسے کافر کہا اور اس کی ہمراہی کو امام زمانہ سے جنگ کے مترادف گردانا۔

دوسری طرف اس روشن خیال نما گروہ نے، اس "هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ" کے "جُعلّق" لوگوں نے (ان تنخواہ دار طعنہ زن چغل خوروں نے) کہ جن کی سرحد پہلے گروہ سے ملتی تھی اور جو صرف تہران کی کینٹینوں

میں' احساس ذمہ داری پوری کرتے ہیں' وہی لوگ کہ جو گمنامی اور فقر کا دکھ جھیلتے ہیں اور ہر اس شخص کو بھنبھوڑتے اور اس پر دولتی جھاڑتے ہیں جس کے اندر سرمایہ سخن اور فکر کی بالیدگی دیکھتے ہیں۔ انہوں نے دوسری صورت سے اس پر حملہ کیا اور خرافات پرستی اور عوامی تحریکوں پر سنگ زنی کا الزام دھرا اور کہا : "مذہب کی آڑ میں اس طرح کے امور' وہ کسی شکل میں کیوں نہ ہوں' دھوکہ ہیں' منفی اثرات پر مبنی ہیں' ذہنی فریب ہیں' اجتماعی مسائل اور انسانی ذمہ داریوں کے نقطہ نظر سے ان کاموں کا کوئی فائدہ نہیں' وہ عثمانی حکومت کو ترقی پذیر گردانتا ہے' تمدن کا مخالف ہے' مشینوں کو پسند نہیں کرتا' بے اصول آدمی ہے' اپنے طبقے کی تشخیص نہیں کرتا' وہ ایک خاص قسم کی فلسفیانہ سوچ' آزاد ذہنیت' کڑوی اور بدبیں روح اور مبہم' تخیلی اور اشرافی جہاں بینی کا حامل ہے۔ اس کا دکھ اور منتہائے آرزو کا فکائی اور کاموئی ہے اور فکر' بدھ اور لاؤتزو سے سیراب ہوتی ہے..... اور بالاخر وہ اپنے اندر کے ایک ایسے بے چین' بے قرار اور مضطرب انسان سے سروکار رکھتا ہے کہ جو بھری محرومیتوں اور کچلی خواہشوں کا حامل ہے' وغیرہ وغیرہ۔"

اور وہ ان تمام فاضلانہ' ادیبانہ اور عمرانیانہ تنقیدوں کے جواب

میں لکھتا ہے :

"ان تمام باتوں کے دفاع میں، میں کچھ کہنا نہیں چاہتا اور اس بات کی ضرورت محسوس نہیں کرتا کہ ان تہمتوں کو واپس لوٹاؤں، اور اگر محسوس بھی کرلوں تو میرے پاس اس کا حوصلہ نہیں ہے، میرے لئے نہ میری ذات اہم ہے اور نہ ناقدوں کی تنقید، کہ میں ان کے حملوں کے مقابل "اپنی دفاع" کے ضعف کو اپنے اوپر مسلط کروں، جو کچھ ہم پر بیت رہی ہے اور جن باتوں سے ہم دوچار ہیں وہ اس سے کہیں زیادہ اہم اور حیرت انگیز ہے کہ ہم اطمینان سے بیٹھ کر ہر کسی کے فیصلوں پر تشویش کریں، اور احساس سے اس قدر عاری جیئیں کہ ہر ناقد کی تنقید ہمیں واویلا سے دوچار کردے....."

کیا اس بات کا امکان ہے کہ کوئی علیؑ کا سچا محب ہو اور اس کی سرنوشت ان سے مختلف ہو؟ ناکثین، مارقین، اور قاسطین ہمیشہ علیؑ علیؑ کی راہ اور علیؑ کے پیروکاروں کی تاک میں رہتے ہیں..... اور ان سے کبھی نہیں چوکتے۔

سید محمد موسیٰ رضوی

☆

ضروری وضاحت

جس دم ڈاکٹر علی شریعتی مشہد یونیورسٹی کی تدریس سے محروم کردیئے گئے اور ان کو تہران کے وزارت علوم میں دفتری کام پر مامور کیا گیا' اس دم انہوں نے اس متن کو لکھا اور مشہد ---شہر شہادت--- کو خدا حافظ کہا۔

چونکہ اصل متن پر حاشیہ کچھ بھلا نہیں لگتا تھا اس لئے ہم ضروری وضاحتوں کو یہاں پیش کرتے ہیں :

شروع صفحے پر دیئے گئے تمام عربی اشعار : "قبران فی طوس ۱۰۴ سے..... ماشئت او قذر" تک' عرب کے مشہور شاعر دعبل خزائی کے وہ اشعار ہیں جسے اس نے قم میں اس وقت لکھے جب اسے امام رضا علیہ السلام کی شہادت کی خبر ملی (سفینتہ البحار۔ شیخ عباس قمی۔ صفحہ ۵۱۰) لا اضحک اللہ سن الدھر ۱۰۴ سے آخر تک کو اس نے امام علیہ السلام کی حیات میں شعر کا قالب دیا۔ (ترجمہ نفس المہموم۔ شیخ عباس قمی۔ ص ۲۹۶) ۱۱۲ سے ۱۱۶ صفحہ تک کے موضوع کو جو : "یہ وہ تاریخ ہے جو جغرافیہ کی صورت میں" سے شروع ہو کر

"ان سے اپنی روٹی پکائی جاتی ہے" پر ختم ہوتا ہے کچھ اضافتوں کے ساتھ ڈاکٹر علی شریعتی نے خود اپنی کتاب "کویر" سے لیا ہے۔ صفحہ ۱۲۰ کا موضوع : "اور عوام نے اسے بہت اچھالا" سے لے کر آخر تک، چھار مقالہ عروضی سے یکسر آزاد اقتباس ہے۔ صفحہ ۱۲۰ سے ۱۲۱ تک کے سارے اشعار فردوسی کے ہیں۔

□□

شہر شہادت خدا حافظ

قبران فی طوس : خیر الناس کلھم و قبر شرھم ھذا من العبر

(طوس میں دو قبریں ہیں : انسانوں میں بہترین انسان کی قبر اور آدمیوں میں بدترین آدمی کی قبر۔ اور یہ ایک عبرت ہے۔)

ما ینفع الرجس من قرب الزکی وما۔ علی الزکی بقرب الرجس من ضرر

(ناپاک، جوار پاک سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کرتا۔ اور پاک جوار ناپاک سے کوئی نقصان نہیں اٹھاتا۔)

ھیھات کل امرء رھن بما کسبت ہداہ، فخذ ما شئت او قذر

(ھیھات کہ ہر انسان اپنے حاصل کردہ شے کے ہاتھوں گروی ہے ہر کسی کا دو ذریعہ انتخاب ہے اور یہ تمہارا کام ہے کہ تم پاکی کو اختیار کرو یا ناپاکی کو۔)

لا اضحک اللہ من الدھر ان ضحکت و آل احمد مظلومون قد قھروا۔

(اگر دھر کو ہنسنے کا یارا ہو تو خدا ہرگز اس کو نہ ہنسائے اس لئے کہ احمد کے جائے، ظلم و قہر کی بھینٹ چڑھ گئے ہیں۔)

مشردون نفوا عن عقردار ھم، کانہم قد جنوا مالئیس یغتفر۔

(ان کے نام ناسزا گوئیوں اور تہمتون کی زد پر ہیں۔ اس کے گھرانے کا شیرازہ بکھر گیا ہے، وہ سب پراگندہ ہیں، انہیں اپنے بسے بسائے گھروں سے نکال دیا گیا ہے۔ وہ اپنے شہر و دیار سے جلاوطن کر دیئے گئے ہیں، گویا انہوں نے کوئی ایسا جرم کیا ہے جو ناقابل معافی ہے۔)

..... ☆ ..... ☆ .....

اور کتنی معنی خیز ہے یہ "بارگاہِ ولایتمدارِ سلطانِ ارض طوس۔" اور کتنا فصیح و بلیغ سمبل ہے بام حرم کا یہ طلائی گنبد جس کے نیچے خلیفہ اور امام، جلاد اور شہید یکجا سو رہے ہیں..... میں کیا کہہ رہا ہوں۔

ہارون بیچ میں اور امام اس کے پاس۔ یعنی امام کی تکریم کے لئے انہیں خلیفہ کی قبر کے قریب دفن کیا گیا ہے اور خلیفہ کے مقبرے اور امام کے مدفن کے ایک گوشے میں، شروع دور میں "حمید بن قحطبہ" کا گھر۔

اور امام کے حرم کا صحن، اس کا باغ۔ وہ باغ کہ جس کے زہر آلود انگور سے امام کی پذیرائی کی گئی۔

حیران کن بات ہے "عمارت" کس حد تک سبق آموز اور آگاہی فراہم کرنے والی ہوتی ہے!

آج "عمارت سازی" کے فلسفے پر گفتگو ہوتی ہے۔ دنیا کے کس حصہ پر عمارت اتنی فیلسوف اور گہری ہے!

آج "فلسفہ تاریخ" پر بہت کچھ کہا جارہا ہے۔ کس زمانے میں "فلسفہ تاریخ" اس طرح ایک "عمارت" کی شکل میں مادی صورت اختیار کرسکتی ہے؟

چودہ صدیاں بیت گئی ہیں کہ جس میں "اسلام تاریخ" اور "تاریخ اسلام" پر گفتگو عمل میں آرہی ہے، اور اس میں تضاد، تحریف، نفاق، حق و غصب، اسلامِ حاکم اور اسلامِ محکوم، خلافت و امامت، "نمود" و "بود" اور مومن و ایمان..... کے باری میں تحقیق و تشریح ہورہی ہے۔ کون ایسا محقق، مبلغ، مصنف، مورخ، متکلم، مفسر، فقیہ، محدث..... اور اسلام شناس ہے جو کُل کی کُل حقیقت و واقعیت کی اس طرح تصویر کشی کرے، اور اتنے سارے اسرار و ابہام، ذہنی مفاہیم، باطنی عواطف، نظری اختلافات، علمی اجتہادات، نیز مذہبی

جدالوں' سیاسی کشاکشوں' فوجی کارروائیوں' فکری مکتبوں' طبقاتی تضادوں' اجتماعی رابطوں' تاریخی جھگڑوں..... وغیرہ وغیرہ کو کرہ ارض کے اس ایک چوتھائی حصہ پر چودہ صدیوں کے طویل عرصے میں' ایک گھر اور ایک گنبد میں رونما کرے؟

اینٹوں میں لکھے ہوئے جملوں' سونے' چاندی اور کانسی سے لکھی ہوئی عبارتوں' دروازوں' سردروں' اور دیواروں پر لکھے ہوئے عناوین' منسوب ابیات اور ان ابیات میں' ان ناموں کی فہرست پر غور کیجئے کہ جن کا تعلق' حکومتوں اور تنظیموں وغیرہ سے ہے :

دارالحفاظ' دارا الضیادہ' دارالسیادہ' دارالعزہ' (۱) اور دارالعبادہ۔

کفشداری' باورچی خانہ' مہمان خانہ' نقار خانہ' محافظین کا کمرہ' استقبالیہ ہال' آئینہ کاری سے مزین ہال..... اور نیز انتظامی امور میں :

نگراں ۱' نگراں ۲' نگراں ۳' نگراں ۴' نگراں ۵' باضابطہ خدام'

۱- یہ نئی تعمیر ہے جو بریگیڈیئر جنرل "عزیزی" کی گورنری کے زمانے میں ان کی سرپرستی میں بنی۔

اعزازی خدام، نقارچی کا دربان، استقبالیہ امور پر مبنی دفتر، باغات، تبلیغات، املاک، اراضی، موقوفات، کرایہ جات اور نذورات پر مبنی تنظیمیں..... اور ان لوگوں کے نام جنہوں نے گزشتہ صدیوں میں اس آسمانِ مقدس کی نسبت اپنی زمینوں کو وقف کرنے، تعمیراتی کام میں حصہ لینے، نئی عمارت بنانے، یا کسی ایوان یا مینار کی طلا پوشی کے ضمن میں خدمت گزار یا ارادتمند کے عنوان سے کتبوں اور کتابوں میں ہمیشگی اختیار کی ہے :

سلطان محمود غزنوی، سلطان سنجر سلجوقی، شاہ رخ شاہ مغل، مغل ملکہ گوہر شاد، بایسنقر، مغل شہزادہ سلطان ابوسعید، سلطان بابر شاہ اور نادر شاہ وغیرہ۔

اور بڑے بڑے نامی گرامی لوگوں، اعیان، اشراف اور ایرانی، تاتاری، ترک، مغل اور ایلخانی خواتین کی وہ فہرست جو وقف ناموں اور کتابوں میں محفوظ ہیں۔

اور یہ سب اس امر کو واضح کرتے ہیں کہ "تاریخ کے حادثہ سازوں" نے برے وقت میں کس طرح یہاں پناہ لی ہے اور کس طرح وقت کے ان سرداروں، اور زمین کے ان سرکشوں نے اس آستانے کی قدم بوسی کی راہ اختیار کی ہے اور اپنا سرخاک اخلاص پر دھرا

ہے! یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ آستان ملائک پاسبان' تاریخ کی تین قوتوں کی وعدہ گاہ رہا ہے اور صاحبان اقتدار' زمیندار' اور علماء دین ---کہ جن کی سیاسی' اقتصادی اور اعتقادی رعیت میں ہر جگہ کے لوگ ہمیشہ رہے ہیں--- اپنی رعایا کے ساتھ سلطان علی بن موسیٰ الرضا علیہ السلام کے دربار ولایتمدار کا رخ کرتے رہے ہیں اور اس بات کو ظاہر کرتے رہے ہیں کی ان کی سیاسی' مادی اور معنوی طاقت اور سارا جاہ و جلال اس مقدس آستانے کی بدولت ہے۔ اور زمین پر ان کا یہ مقام و مرتبہ' اس فلک بارگاہ کی عنایت اور انعام کا ثمرہ ہے اور یہ سب معاشرے کے تین نظاموں میں' لوگوں کی زندگی کے شموس (سورج) اور "سلطان ارض طوس" کے مصنوعی اقمار (قمر کی جمع) کے "شمس الشموس" ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ شاہ عباس کبیر اپنی پوری شان و شوکت اور جاہ و جلال و دبدبہ و اقتدار سلطنت کے ساتھ باوجود اس کے کہ اس کا قصر علی قاپو سرود و شراب کے ایک بڑے ہال سے مزین ہے اور باوجود اس کے کہ وہ اپنے خاندان کے تمام مردوں کا قتل عام کرتا ہے تاکہ اسے کسی مدعی کی سرکشی کا خطرہ باقی نہ رہے' اس بارگاہ کی نسبت اس کے ایمان و اخلاص اور عشق و ارادت کا یہ حال ہے کہ اپنے جوتوں

کو ---دنیا کی سلطنت کے پائے تخت --- اصفہان سے اپنے گلے میں ڈال کر ---دین کی امامت کے پائے تخت--- "مشہد" تک پیادہ پا آتا ہے!

امام رضا علیہ السلام کے حرم مبارک میں داخل ہو کر قینچی اٹھاتا ہے اور ---خادموں کی طرح--- موم بتی کے سروں کو کاٹتا ہے اور اس وقت کی مقدس ترین روحانی شخصیت "شیخ بہائی" کہ جو سلطان کی پشت پر ایستادہ ہوتا ہے فی البدیہ اس خوبصورت اور پر تاثیر شعر کو پڑھتا ہے :

قینچی تو بہ احتیاط زن ای خادم
ترسم ببری شہپر جبریل امین

ترجمہ :

قینچی کو ذرا بچ کے چلا اے خادم
ڈرتا ہوں کہ جبریل کے شہپر نہ کٹیں

یہ مقدس آستان' بے پناہوں کی پناہ گاہ۔ بے خانماؤں کا گھر۔ متعاقب لوگوں کا قلعہ' ہر مذہب و ملت کے لوگوں کی جائے امن اور ان بے سہارا اور نہتے لوگوں کی گریز گاہ رہا ہے کہ جو جلادوں کے تیغ سے بچتے پھرتے ہیں۔

مشہد نے "شہر" کی صورت اس طرح اختیار کی کہ جب چنگیز کی یورش کے بعد اس کے بیٹے "تولی" نے طوس میں خون کے دریا بہائے تو وہ لوگ کہ جو اپنے آپ کو اس قتل عام سے بچا سکے انہوں نے امام کے روضے میں پناہ لی اور طوس کے اس عظیم شہر کے حدود میں واقع یہ چھوٹی سے زیارت گاہ اچانک ایک بڑے شہر میں بدل گئی اور طوس ایک ویران قتل گاہ بن گیا! چنگیز کے وارثوں نے بڑی کوشش کی کہ لوگوں کو اس پناہ گاہ سے شہر واپس لوٹائیں لیکن کوئی واپس نہیں لوٹا اور اس بات کو ترجیح دی کہ اپنے امام کی طرح ان کے نزدیک ان ہی کی طرح غریب رہیں اور اپنے گھر اور اپنے دیار کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیں۔

اس طرح اس شہر کی بنیاد پڑی۔ اور یہیں سے اس کا آغاز ہوا اور یہ اب بھی اسی روایت پر قائم ہے جس روایت پر پہلے قائم تھا!

اس شہادت گاہ کی پراسرار کشش کہ جو مظلوم دلوں سے گفتگو کرتی ہے اس "روح" کے کماکیف کو منظر عام پر لاتی ہے۔ اور اس ہولناک تپتے صحرا میں ان زخم خوردہ ہرنوں کو کہ جو صیادوں کے تعاقب سے گریزاں ہیں۔ اپنی پناہ میں لیتی ہے۔ اس لئے کہ اس خشک چراگاہ میں صرف بھیڑیئے' لومڑی اور چوہے اچھی زندگی گزار رہے

ہیں۔ ان کے درمیان صرف بھیڑ ہے جو مطمئن ہے وگرنہ آہوؤں نے ہمیشہ رمیدگی اختیار کی ہے اور ہر جگہ صحرا میں بے مامن رہے ہیں' اس لئے کہ نہ ان کے پاس بھیڑیئے جیسا تھوبڑا ہے اور نہ ہی گردن جو رسی کو بل دے سکے۔

اب صحرا کو سن لیجئے :

--- یہ وہ تاریخ ہے جو جغرافیہ کی صورت میں مجسم ہوئی ہے' وہ پراسرار ناپیدا کنار فراخی کہ جس نے مایوسی اور خاموشی کے ساتھ اپنے آپ کو پھیلاؤ کے حوالے کردیا ہے--- خشک اور بے آب و آبادی' نہ اس میں پہاڑوں کی چوٹی کا غرور ہے' نہ زمزمہ ہے' نہ نہر ہے' نہ چشموں کا عاشقانہ ترانہ ہے۔ نہ کوئی باغ' نہ پھول' نہ منظر' نہ چراگاہ' نہ راستہ' نہ سفر' نہ منزل' نہ مقصد' نہ کسی دریا کی مستانہ چال' نہ سمندر کا آغوشِ منتظر' نہ کوئی ابر' نہ خندہ رعد و برق اور نہ دردِ گریۂ تند..... کچھ بھی تو نہیں!

بالکل ساکت' خاموش' غمگین' مایوس' جھلسا ہوا۔ دیو' جن' ارواح خبیثہ اور آدم خور بھیڑیوں کا مسکن' نہاں خانۂ خناس' اور بربادی مچانے والے سیہ کار غاسق' فسونکار نفّاثہ اور خیانت کار حاسد کی جولانگاہ۔

خیال' اور افسانہ و افسوں کی زادگاہ' پانی نہیں سراب کی سرزمین۔ سکون نہیں' ہراس کی خاموشی۔ جس کی جھلسا دینے والی بے رحم ہوا بھیجے کو کاسہ سر میں ابالتی ہے' جس کی تپتی زمین سے خوف کھا کر کوئی سبزہ' کوئی پودا فرشِ خاک سے سر نہیں اٹھاتا' جس کے اطراف رہنے والے لوگوں کے بدن کی کھال بالکل جل گئی ہے۔ جن کے چہرے خشک اور پیشانیاں شکن در شکن ہیں۔ ان کے لئے صحرا کو دیکھنا دشوار ہے' وہ اپنے ہاتھ سے اپنی آنکھوں پر سایہ کرتے ہیں تاکہ صحرا کو نہ دیکھیں۔ نہ دیکھیں کہ دیکھ رہے ہیں' نہ جانیں کہ جان رہے ہیں۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس میں کوئی طوفان سر اٹھاتا ہے' اور افلاک پر مٹی بکھیرتا اور اس پر دامن خاک تانتا ہے اور پھر اطراف کے دیہاتوں پر برس پڑتا ہے اور جب تھم جاتا ہے فروکش ہو جاتا ہے تو پھر اپنے اصلی روپ میں آجاتا ہے' اسی طرح جس طرح کہ پہلے تھا۔ صحرا کی بار بار طوفان خیزی اور بار بار کا سکون اسے ہمیشہ تغیر کے عالم میں رکھتا ہے مگر اس میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ وہ سمندر کی طرح ہے۔ لیکن پانی کا سمندر نہیں جس میں موتی' مچھلی' اور مرجان تیر رہے ہوں' ریت کا سمندر' جس میں خاک' مٹی' گرد و غبار اور سانپ

سنپولے گردش میں ہیں! جانوروں میں زیادہ تعداد رینگنے والوں کی ہے۔ کبھی کوئی تنہا بھولے بھٹکے پنچھی یا خوف وہراس کی شکار بے گھرو بے در کی مرغابی کی پرواز بھی دیکھنے میں آتی ہے۔ صحرا میں اگنے والی شے بس ترنجبین(Manna Tree) ہے اور "تاغ" یہ بے باک اور پر شکیبا درخت کہ جو صحرا کی سختی کے باوجود پانی کی ضرورت اور ہر نوازش و ستائش سے بے نیاز، صحرا کے خشک اور تپتے سینے سے ریت کے دھکتے انگاروں پر سر اٹھاتے ہیں اور جم جاتے ہیں۔ یہ زندگی کو داؤ پر لگا کر جیتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک، ایک طاقتور دیوتا ہے! نڈر، مغرور، تنہا اور غریب۔ "یہ وہ جری اور سورما درخت ہیں جو جہنم میں اگتے ہیں" لیکن ان میں نہ پھل ہوتا ہے اور نہ پتے۔ یہ پھول نہیں بکھیر سکتے، پھل نہیں دے سکتے۔ ان کے پہلوؤں سے کونپلوں کے پھوٹنے کا ولولہ، کلیوں کا شوق اور ان کی شگفتگی ان کے وجود میں گھٹ کر مرجاتی ہے۔ اور انجام کار صحرا کے مقابل گستاخی کے جرم میں انہیں جڑ سے اکھاڑ کر تنور میں ڈال دیا جاتا ہے اور ان سے اپنے لئے روٹی پکائی جاتی ہے۔

یہ ہے ان کا مقدر اور ان کی سرنوشت!

ایک گھبرایا ہوا آہو "ضامن آہو" (امام رضاؑ) کی آرام گاہ میں

آیا تاکہ اس کے ایمان و امان کے "بست" (حدود) میں پناہ گزیں ہو۔
یہ وہ جگہ تھی جہاں اگلے وقتوں ایک باغ تھا کہ جس نے اس کی خاک کو اپنی زمردی پوشاک میں چھپالیا تھا اور ایک چشمہ بھی تھا کہ جو غیب سے از خود پھوٹ نکلا تھا۔

مگر اس چشمے سے فریب ابلتا تھا۔

اس باغ میں سیاہ پھول کھلتے تھے۔

اور زہر بھرے انگور اور قاتل انار کی پیداوار تھی۔

اس کی سرگزشت نے اس کے قوم کی سرنوشت کی یاد کو تازہ کیا' کہ جس نے سینکڑوں سال پہلے "عدل نوشیروانی کی زنجیر" سے آزادی حاصل کی اور "بے زنجیر" کے عدل کے درپے "مدینہ" کا رخ کیا۔

مگر بغداد میں پھر عدلِ زنجیر نے اس کے پیروں میں بیڑیاں ڈال دیں۔ وہ پیغمبر کی تلاش میں نکلا تھا مگر اسے غاصب خلیفہ کا منہ دیکھنا پڑا۔ اور اب ایک ناکام مہاجروں کی ذریت کا ایک تنہا مہاجر "امام" کی پناہ میں آیا' اور اسے ان کے نائب غاصب کا سامنا ہوا۔

ارے میں کیا کہہ رہا ہوں؟

ان کے حرم میں جلاد خانہ!!

اوہ۔ یہ کتنا ہولناک دائرہ ہے!

ان سے نزدیکترین شخص' ان کا نزدیکترین دشمن اور بدترین خلق!

اس سچائی کے محور پر آھورائی آفتاب!!

ہر نزدیکترین مدار' دروغ تر اور اھریمنی تر

..... ☆ ..... ☆ .....

اس تنہا مہاجر' اس بے کس و بے در آھو'

اس ناکام مہاجروں کی ذریت کے بقیہ اور ان مجروح آہوؤں کے ڈار کے رمیدہ نے (کہ جنہوں نے "کسریٰ" "مکھیا" اور "موبد" (زرتشتی پیشوا) کی مذموم تثلیث سے پیام نبوت کی رخ پر' مہبط وحی کی سمت کوچ کیا تاکہ اپنے آپ کو "آزادی' برابری اور آگاہی کی الٰہی مثلث تک پہنچائے' مگر وہ خلیفہ' خواجہ اور فقیہ کی مذموم تر تثلیث کی بھینٹ چڑھ گیا) "بھیڑیئے' لومڑی اور چوہے" کی تثلیثِ شر کی نفرت سے ان بھیڑوں کے گلّوں سے علیحدگی اختیار کی جنہوں نے اپنے سر ریت میں دے رکھے تھے۔

اور پیام وصایت پر عمل کرتے ہوئے'

پشت پر تازیانوں کے نیل' لب بر پیاس کی شدت' پیر میں آبلوں کے زخم اور دل میں عشق کی گرمی کے ساتھ حریم امام کا رخ کیا۔

مگر وا مصیبتا!

یہ "ہارون" کا حرم ہے۔

اور امام اس کے پہلو میں ہیں

گویا امامت متن (درمیانی حصے) میں نہیں؟

یعنی امام، خلیفہ کے حاشیہ نشین؟

یعنی امام بھی، طاقت کے سیوا میں؟

یعنی تقویٰ کی سبز ردا زور کے کاندھوں پر؟

یعنی تیغ، طلا، اور تسبیح، دین کے پردے کی آڑ میں؟

یعنی امام کے نام پر، ہارون کے گرد طواف؟

یعنی وہاں خلافت رسول، اور یہاں نیابت امام؟

یعنی عصمت کے ضریع مطہر میں رجس ہارون پنہاں؟

یعنی پھر تطہیر قوت؟

تقدیس طلا اور توجیہ تزویر؟

یعنی دعوت دین کے ذریعے لوگوں کو بارگاہ کی طرف بلانا؟

مجھے کچھ معلوم نہیں، ہاں یہ معلوم ہے کہ تپتے صحرا کے ترنجبین و تاغ کے کنبے کا یہ نورستہ نہال، حمید بن قحطبہ کے باغ میں جونہی برگ و بار پر آیا، جاڑے کی رت آگئی۔

اور لکڑی کے سوداگروں' کوئلہ کے سازندوں' تنور کے دھکانے
اور روٹی کے پکانے والوں نے'
اسے جڑ سے اکھاڑ دیا۔
اور اس آھوئے رمیدہ کو اپنے "بست ضامن" سے پکڑ کر صیاد
کے حوالے کردیا۔

اور اب اس سمے جب کہ خلافت نے ایک بار پھر یورش کی
اور سعد بن ابی وقاص نے ایک اور قادسیہ کو جنم دیا
اور اس دفعہ وحشی عربوں نے مغرب سے دھاوا بولا
اور مدائن کو تہس نہس کردیا' اور ہماری زبان' ہمارے ایمان'
ہماری ثقافت اور ہماری تاریخ کو غزنویوں کے ہاتھوں دفن کردیا'
اور اس سرزمین کے لوگوں کے لئے اسارت و جہل کو مدنیت و
علم کے نام پر سوغات لائے اور سارے برج و بار کو ڈھادیا۔

اور تمام حصاروں' دیواروں اور چھتوں کو گرادیا
تمام آتش کدوں کو سرد و خاموش کردیا' اور.....

زترک و ز ایران و از تازیان
نژادی پدید آمد اندر میان
نہ ترک و نہ ایران و تازی بود

سخنہا بہ کردار بازی بود
زیانِ کسان از پی سود خویش
بجو یندو دین اندر آرند پیش

تو خراسان کے ایک دھقان زادے نے بغیر کسی طاقت اور بغیر کسی پناہ کے، اپنی عمر کے سرمائے اور اپنے عشق کی توانائی کی ساتھ اپنی زندگی وار دی تاکہ وہ ان افتخارات اور ان عشق و ایمان و فنون و ثقافت و جوانمردی کی داستانوں کو اکٹھا کرے۔ انہیں از سر نو ترتیب دے کر لوگوں کی یادوں میں بسائے جنہیں عربوں کی خلافت، ترکوں کی سلطنت اور برمکی، نوبختی، طاہری، ساسانی اور صفاری ملک فروشوں نے نیست و نابود کردیا تھا۔

اس نے ۳۵ سال بن صلے، مشقت جھیلی، اور اس دگرگوں شدہ قوم کی یادوں سے محو، ایمان کے "یادنامہ" کو گلدستہ نظم میں سجایا مگر آخرکار اس کی مشقتوں پر پانی پھیردیا گیا اور جن لوگوں کو داستانِ شجاعت پسند نہیں آئی اور ان کی عصبیت نے اس بات کو پسند نہیں کیا کہ مُردوں اور نابیناؤں کے بدن میں عیسیٰ کا حیات آفریں دم پھونکا جائے۔ انہوں نے اسے بے گھر اور بے در کردیا، اور وہ افراد کہ جو لوگوں کے جہل سے علم کا کبادہ (جمناسٹک میں استعمال ہونے والی لوہے

کی کمان) کھینچتے رہے اور دین کی مفقودیت سے دین کے دعویدار بن بیٹھے۔ انہوں نے علوی تشیع کے قصور پر اس کی تکفیر کی اور عوام نے اسے بہت اچھالا اور کسی تعصب سے گریز نہیں کیا اور کہا :

وہ معتزلی عقائد کا حامل رافضی ہے' اور یہ شعر اس کے اعتزال کی دلیل ہے : ؎

به بینندگان آفریننده را
نه بینی مرنجان دو بیننده را

اور نیز یہ اشعار بھی اس کے رفض پر دلیل ہیں :

خردمند گیتی چو دریا نهاد
برانگیخت موج از او تندباد
چو هفتاد کشتی درو ساخته
همه بادبانها برافراشته
میان یکی خوب کشتی عروس
بر آراسته همچو چشم خروس
پیمبرؐ بدو اندرون باعلیؑ
همه اهلبیت نبی و وصی
اگر خلد خواهی به دیگر سرای

بنزد نبی و وصی گیر جای
گرت زین بد آیدہ گناہ من است
چنین دان واین راہ، راہ من است
براین زادم وھم برین بگزرم
یقین دان کہ خاک پئ حیدرم

..... غم کے پہاڑ اس پر ٹوٹ پڑے۔ اسے محمود (غزنوی) کی سیاست کا علم ہوگیا، اور وہ راتوں رات غزنین سے فرار ہوگیا..... اسی عالم میں چھ ماہ اس پر گزر گئے۔

کہنے والوں نے کہا : "تم ایک شیعہ عقیدے کے آدمی ہو اور جو بھی رسول کے گھرانے سے تولّی رکھتا ہے اس کا دنیا سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا اس لئے کہ ان کو خود اس سے دلچسپی نہیں تھی۔"

لیکن پھر ایک عرصے کے بعد اسکی ۳۵ سالہ زحمتوں کے صلے کو ایک اونٹ پر لاد کر طوس روانہ کیا گیا، مگر ہوا یہ کہ رودبار طوس کے دروازے سے یہ اونٹ اندر داخل ہو رہا تھا اور فردوسی کا جنازہ اسی دروازے سے باہر نکل رہا تھا۔

ایسے میں طوس کے محلے طبران کے ایک واعظ شیخ ابوالقاسم گرگانی نے جو اس شہر کا ایک بڑا فقیہ تھا، بغض و تعصب سے کام لیا

اور کہا :

میں اس بات کی اجازت نہیں دوں گا کہ اس کے جنازے کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفنایا جائے اس لئے کہ وہ ایک رافضی تھا۔ لوگوں نے بہت سمجھایا مگر اس فقیہ کے سر میں بات نہیں آئی۔ وہیں دروازے کے اندر فردوسی کا ایک باغ تھا۔ چنانچہ اس باغ میں اسے سپرد خاک کیا گیا.....“

”کہتے ہیں فردوسی کی ایک لڑکی تھی اعلیٰ ظرف کی۔ بادشاہ کے فرستادہ نے وہ صلہ اسے دینا چاہا مگر اس نے لینے سے انکار کردیا اور کہا : ”میں اس کی محتاج نہیں ہوں۔“ بادشاہ کو ساری رپورٹ پیش کی گئی۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ اس فقیہ سے کہو کہ وہ گھر بار چھوڑ کر فوراً ”طوس سے نکل جائے۔“

”فاعتبروا یا اولی الابصار!“

ع۔ش

علی شریعتی کی تعزیت میں امام خمینی کا خط

(ذیل کا متن وہ خط ہے جسے امام خمینی نے اسلامی انجمنوں کے ایک ممبر کو ان ٹیلیگرافوں کے جواب میں لکھا جو ڈاکٹر علی شریعتی کے سوگ میں انہیں موصول ہوئے تھے۔ ہم اس خط کے وصول کرنے والے کے نام کو اس کی درخواست کے پیش نظر ظاہر کرنے سے گریز کر رہے ہیں۔)

شعبان المعظم

بسمہ تعالیٰ

محترمی جناب..... صاحب ایداللہ تعالیٰ

پس از عرض سلام، ڈاکٹر علی شریعتی کو کھو دینے کے سلسلے میں یورپ اور امریکہ اور اس کے مختلف اضلاع کے اسلامی انجمنوں سے متعلق طلباء اور بیرونی ممالک میں مقیم دیگر تمام محترم بھائیوں ایدّھمُ

اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے بے شمار ٹیلیگرام موصول ہوئے۔ چونکہ فردا" فردا" ان کا جواب میرے لئے بعض وجوہات کی بناء پر ممکن نہیں' اس لئے میری درخواست ہے کہ میری طرف سے آپ میرا شکریہ تمام بھائیوں کو ادا کردیں۔ اس عمر کے آخری حصے میں میری تمام امیدیں بالعموم نوجوان طبقہ سے وابستہ ہیں جن میں اندرون و بیرون ملک کے طلباء اور دینی طلاب سبھی شامل ہیں۔ مجھے توقع ہے کہ روشن ضمیر متفکر اور دانشور حضرات' اسلام کے نجات بخش دین کی ترجیحات کو کہ جو ہر پہلو سے نوع بشر کی سعادت کا کفیل' دنیا و آخرت میں نیکی کے راستوں کا ہادی' قوموں کی آزادی اور استقلال کا محافظ' مربیِ نفوس' روحانی اور نفسانی عیوب کا ماحی' اور حیات انسانی کا رہنماء ہے' عوام کے سامنے پیش کریں گے۔

مطمئن رہیں کہ اگر ہم اسلام کو اسی صورت میں جس میں کہ وہ ہے لوگوں کے سامنے پیش کریں اور ان ابہامات' انحرافات اور کجرویوں کی اصلاح کریں کہ جو بدخواہوں کے ہاتھ ظہور پذیر ہوئی ہیں تو مطمئن رہیں کہ وہ صحت مند نفوس کہ جنہوں نے فطرت اللہ سے روگردانی نہیں کی ہے اور باطل اغراض اور حیوانی شہوتوں کا شکار نہیں ہوئے ہیں' سب کے سب اس کا رخ کریں گے اور اس کی

برکتوں اور اس کے انوار سے بہر مند ہوں گے۔ میں اپنے قابل احترام نوجوانوں کو انسان دشمن عناصر اور ان کے خود فروش ایجنٹوں کے ہاتھ سے نجات اور کامیابی کی نوید دیتا ہوں۔

نوجوان اور روشن فکر طبقے کو چاہئے کہ وہ ملک کے اندر اور ملک کے باہر اپنے روابط میں استحکام پیدا کریں اور اسلام کے پرچم تلے کہ جو توحید کا واحد پرچم ہے یکدل اور ہم آواز ہو کر انسانیت اور انسانوں کے حق کا دفاع کریں تاکہ خدا نے چاہا تو اسلامی ممالک سے اغیار کے تسلط کا خاتمہ ہو جائے۔ آپ سب کو چاہئے کہ بڑی ہوشیاری کے ساتھ ان درپردہ عناصر سے احتراز کریں کہ جو اسلامی انجمنوں کے درمیان پھوٹ ڈالنے کے درپے ہیں اور ان کا تعلق بالیقین اغیار کے نمک خواروں سے ہے۔ ہمیں چاہئے کہ ہم ان کو اپنے سے دور رکھیں۔ واعتصمو بحبل اللہ جمیعا" ولا تفرقو۔

والسلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

روح اللہ موسوی

علی شریعتی کون تھا

علی شریعتی منزل نہیں راستہ تھا' بت نہیں چراغ تھا۔ وہ گراں گوش لوگوں کی نسبت فریادی اور بے حس وجدانوں پر ہتھوڑا تھا' صراط تکامل کا ایک متحرک فرد تھا' ایک مجسم درد اور درد کا ایک مجسمہ تھا' اپنی باتوں پر پابند اور وفادار تھا' اپنی دینی آرزوؤں کی تکمیل کے لئے نہ کسی سے ڈرتا تھا اور نہ کسی کی رو رعایت کرتا تھا۔ جن لوگوں نے اسے بت بنا کر اس کی پرستش میں اپنے آپ کو نقد و تامل کی فکر سے آسودہ کرلیا ان پر اس نے آواز بلند کی اور کہا' اگر اس سے کوئی کام ہوا ہے تو بس یہی کہ اس نے کسی کی عابدانہ تقلید نہیں کی ہے۔ آپ بھی اگر اس کی راہ چل رہے ہیں تو اس کی عابدانہ تقلید نہ کیجئے۔

وہ اب ہم میں نہیں ہے۔ "تلک امتہ قد خلت لہا ما کسبت ولکم ما کسبتم ولا تسئلون عما کانوا یعملون" (بقرہ : ۱۴۱) وہ اپنا کام کرگئے اب ہم باقی ہیں' ہمیں چاہئے کہ ہم اپنا کام کریں' ہم دوسروں کے کام کے جواب دہ نہیں ہیں۔ ہمارے لئے علی شریعتی ہوں یا کوئی اور' اس کے مخالف ہوں یا موافق' سب عبرت کے آئینے ہیں۔ سب دریچے ہیں کسب معرفت و بصیرت کے لئے۔ ہمارے لئے کام آنے والی چیز وہ چراغ ہے جو جانے والے ہمارے لئے چھوڑ گئے ہیں۔